اردو کا پہلا بین الاقوامی ہفت روزہ

قیمت تین روپے

یحییٰ ایاش کون ہے؟

یروشلم میں حالیہ بم دھماکوں کے پیچھے اصل دماغ جس کے نام سے اسرائیل اور امریکہ کے حکام دہلے جاتے ہیں

اس شمارے میں

مغرب کی خدا بیزار تہذیب پر

اسلامی اسکارف کا حملہ

AUSTRALIA .... A$3.50	DENMARK .... D. KR. 14.00	ITALY .... LIT. 3,000	NEW ZEALAND .... NZ$4.95	SRI LANKA .... Rs 40
BANGLADESH .... Taka 20	FRANCE .... Fr 10	JAPAN	NORWAY .... N. KR12.00	SWEDEN .... Kr 15
BELGIUM .... Fr 70	FINLAND .... F. MK 10.00	KOREA .... W 1.800	PAKISTAN .... Rs. 15	SWITZERLAND .... Fr 3
BRUNEI .... B$4.50	GERMANY DM3.50	MALAYSIA .... RM 3.00	PHILIPPINES .... P 25	THAILAND .... B 40
CANADA .... C$.3.50	HONG KONG .... HK$ 15.00	MALDIVES .... Rf 12.00	SAUDI ARABIA .... SR 3	U.K. .... £ 1.30
CHINA .... RMB 12.50	INDONESIA .... RP 3,400 (INC.PNN)	NETHERLANDS .... G 3.30	SINGAPORE .... S$ 2.50	U.S.A. .... US $ 3.00

سنگھ پریوار کے سائے میں پلنے والے رشدی سے بھی خطرناک

ایک نام نہاد مسلم صحافی کی زہر افشانیاں

تحریر: ڈاکٹر ظفرالاسلام خاں

ہمیں اس کی خبر نہیں کہ سلمان رشدی، بابری مسجد اور ابھی حال میں تسلیمہ نسرین کے سطحی مسائل میں الجھ کر ہم ان سے کہیں زیادہ سنگین واقعات کی طرف سے غافل ہیں جو ہمارے گرد و پیش آئے دن ہوتے رہتے ہیں۔ سنگھ پریوار کے چہیتے ارون شوری برسوں تک اسلام پر حملے کرتے رہے اور کسی کو توفیق نہ ہوئی کہ ان کی ملمع کارانہ دانشوری کا پردہ فاش کرتا۔ ادھر کچھ دنوں سے ایک صاحب جو دین سے کوئی واسطہ نہیں رکھتے اور نام ہی کے مسلمان ہیں اسلام پر کیچڑ اچھالنے کے اسی پرانے کھیل میں مصروف ہیں۔ ان کا تازہ ترین کارنامہ روزنامہ ٹائمز آف انڈیا کی 23 اپریل 1994 کی اشاعت میں شامل ایک مضمون ہے۔ ہرچند کہ اس مضمون کی طرف میں خاصی دیر سے توجہ دے رہا ہوں لیکن یہ توجہ اب بھی ضروری ہے کیوں کہ جن خطرناک خیالات کی اشاعت صاحب مضمون کی طرف سے کی جارہی ہے وہ عنقریب پرکشش سرورق کے ساتھ شائع ہونے والی علمی تصنیف کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

اپنے قارئین کی معلومات کے لئے میں بتا دوں کہ صاحب مضمون جناب رشید طالب بار ایٹ لاء نے وکالت کے میدان میں شہرت و دولت کے حصول میں ناکام ہو کر صحافت کا رخ کیا اور کانگریس پارٹی میں اپنے دیرینہ رسوخ کے طفیل میں گاہے گاہے ٹیلی ویژن کے پروگراموں میں بھی آنے لگے۔ اسلام کے کسی رکن کی ادائیگی غالباً آج تک ان سے سرزد نہیں ہوئی۔ لیکن انہوں نے اپنے نام کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسلام پر حملے کر کے خود کو ایک طبقے کے سامنے "اچھے مسلمان" کی حیثیت سے ضرور پیش کر دیا۔ رشید صاحب جو اپنی عمر کے آخری حصہ کو پہنچ رہے ہیں، لوگوں کی توجہ کا مرکز بننے اور ارباب اقتدار کی نظروں میں سمانے کے لئے ہاتھ پیر مار رہے ہیں۔ شاہ بانو کیس کے سلسلے میں ٹائمز آف انڈیا میں خط شائع کر کے مسلمانوں پر پتھر پھینکنے والے پہلے فرد بھی وہی تھے۔ سردست وہ اس ملک کے ایک خود مختار ادارے کی پرعیش فیلوشپ پر فائز ہیں تاکہ ٹائمز آف انڈیا میں شائع اپنے مراسلے کے خطوط پر کوئی تصنیفی کارنامہ انجام دے سکیں۔

یہ بات قابل غور ہے کہ وکالت اور میڈیا کے میدان میں پٹا ہوا اور ناکام شخص آنے والے دنوں میں کس طرح ترقی کے منازل طے کرتا ہے۔ اسلام دشمنی آج ایک مقبول حربہ بن چکا ہے اور ملکی و غیر ملکی وسائل پر قابض طاقتوں کے پاس ٹکڑوں کی کمی نہیں ہے۔ جو وہ بوقت ضرورت بھوکوں کے سامنے پھینک سکیں۔

سنگھ پریوار (آر ایس ایس) کے سائے میں پلنے والے کئی ادیب اور صحافی وقتاً فوقتاً اس میدان میں سرگرم عمل رہے ہیں۔ اور اب رشید طالب مسلم نام کے ذریعے ان کے خیالات کو مزید قابل یقین بنانے میں کوشاں ہیں۔ لیکن ان کی دانشوری جتنی سطحی اور علمیت جتنی مشکوک ہے اسی قدر اب امت میں بالغ نظری اور اعتماد پیدا ہو چکا ہے جس سے مسلمانوں کے درمیان قادیانیت جیسے کسی نئے شوشے کے پنپنے کا امکان نہیں ہے۔

طالب صاحب کے مضمون کی ابتداء اس دعوے سے ہوتی ہے کہ اسلام کو چیلنجوں کا سامنا ہے (حالانکہ حقیقت اس سے مختلف ہے، یعنی یہ کہ دوسرے اسلام سے خائف ہیں)۔ آگے چل کر وہ مسلمان اہل قلم کو یہ ترغیب دیتے ہیں کہ وہ داخلی افراد کی حیثیت سے اس کی تحقیق کریں کہ آج کی دنیا میں اسلام ہی کیوں ایسی مذہبی روایت بن کر رہ گیا ہے جو خود کو بدلنے اور نئی قدروں کے مطابق ڈھالنے سے منکر ہے۔ گویا کہ اسلام کو طالب صاحب کے لباس کی طرح "مصدقہ نئی قدروں" اور معیاروں پر پورا اترنا چاہئے۔ یہ "نئی قدریں" کیا ہیں؟ اور وہ مصدقہ مرتبہ کیسے پاتی ہیں؟ اس کی کوئی دلیل دینے سے طالب صاحب قاصر ہیں۔

اپنے قارئین کی معلومات کے لئے یہ بتادوں کہ رشید طالب صاحب بار ایٹ لاء نے وکالت کے میدان میں شہرت و دولت کے حصول میں ناکام ہو کر صحافت کا رخ کیا اور کانگریس پارٹی میں اپنے دیرینہ تعلقات کے طفیل میں گاہے گاہے ٹی وی پروگراموں میں بھی آنے لگے۔ اسلام کے کسی رکن کی ادائیگی غالبا آج تک ان سے سرزد نہیں ہوئی لیکن انہوں نے اپنے نام کا فائدہ اٹھا کر اسلام پر حملہ کر کے خود کو ایک "اچھے مسلمان" کی حیثیت سے ضرور پیش کر دیا ہے۔

اگلے پیراگراف میں وہ کہتے ہیں کہ اسلام کی ایک کمزوری یہ ہے کہ وہ انسانی حقوق کے تین پوری طرح تسلیم شدہ معاملات میں شدت پسندی برتتا ہے۔ وہ کون سے تین امور ہیں جن کا اسلام رشید طالب پر ہوا ہے اور انہیں تسلیم کس نے کیا ہے؟

لگتا ہے رشید طالب نے حالیہ "تسلیم شدہ حقوق انسانی" کا امریکی نعرہ سن رکھا ہے۔ ان کے نزدیک یہ تین تسلیم شدہ امور ہیں: لبرل ڈیموکریسی، عورتوں کی حیثیت، اور ظالمانہ سزائیں۔ رشید طالب ہی یہ سمجھے ہیں ہماری رہنمائی کر سکتے ہیں کہ یہ تینوں امور "پوری طرح تسلیم شدہ" کیسے ہو گئے اور انہیں تسلیم کرنے والے لوگ ہیں کون؟

یہ بات خاصی مشکوک ہے کہ مغربی ڈیموکریسی ہم سب کے لئے سازگار ہے۔ خود ہمارے ملک میں اور ایشیا اور افریقہ میں کہیں بھی سیاسی انتشار اسی درآمد شدہ نظریے کا نتیجہ ہے جو نہ ہماری تاریخ سے میل کھاتا ہے اور نہ ہی اقدار و مزاج سے

عورتوں کی حیثیت کا قصہ چھیڑ کر رشید طالب ایڈوکیٹ نے ایک اور مذاق کیا ہے۔ اسلام پر عورتوں کی حق تلفی کا وہ الزام لگاتے ہیں لیکن اس پر نظر نہیں کہ ہر سال ان کے ہمسفروں کی ہزاروں بیٹیاں نذر آتش کر دی جاتی ہیں جسے ہندوستانی میڈیا "جہیزی موت" کے نام کا ملمع لگا کر پیش کرتا ہے۔ ستی، دیوداسی اور رحم مادر میں غیر نرینہ اولاد کو ختم کر دینے کے قبیح اعمال اس پر مستزاد ہیں۔

رہی بات "ظالمانہ سزاؤں" کی تو یہ بھی خوب لطیفہ ہے۔ ان کے مغربی احباب جن نرم سزاؤں کی حمایت کرتے ہیں اسی کے نتیجے میں دنیا آج تباہی کے دہانے پر آکھڑی ہوئی ہے۔ مغربی اقدار کے زیر اثر نافذ کردہ نرم سزاؤں کی وجہ سے دہشت گردی، جرم اور تشدد کی وباء ہر معاشرہ میں پھیلی ہوئی ہے۔ تاہم امریکہ میں بھی جو ڈیموکریسی اور حقوق انسانی کا خود ساختہ محافظ ہے، بعض جرائم کے لئے آج بھی سخت سزائیں ہیں اور یوروپ کے بعض حصوں میں یہ بات موضوع گفتگو بنی ہوئی ہے کہ جرم کی لہر پر قابو پانے کے لئے اذیت ناک سزاؤں کو دوبارہ کیوں نہ نافذ کیا جائے۔ دور مت جائیے خود ہندوستان میں ہی جناب رشید طالب کے ہمنواؤں نے بڑھتے ہوئے جرائم اور تشدد کے پیش نظر سخت سزاؤں کے نفاذ کا مطالبہ کیا ہے۔ جن اسلامی سزاؤں کے تصور نے رشید طالب کی راتوں کی نیندیں اڑا رکھی ہیں کہ گذشتہ ایک صدی سے نو آبادیاتی غلبہ کی بنا پر عالم اسلام میں ان پر کہیں بھی عمل درآمد نہیں ہو رہا ہے۔ نو آبادیاتی پنجے استبداد سے بچ رہنے والا واحد ملک سعودی عرب جرائم کی شرعی قوانین پر ہنوز کاربند ہے۔ اور آج امن و تحفظ کے اعتبار سے سعودی عرب کا نیو یارک، اسٹاک ہوم اور دہلی کی سڑکوں سے موازنہ کریں تو اسے جنت کہنا بیجا نہ ہوگا۔

جناب رشید طالب ہماری معلومات میں یہ کہہ کر اضافہ کرتے ہیں کہ ہر "اچھا مسلمان" (جس سے یقینا ان کا اشارہ خود اپنی ہی طرف ہے) "اپنے عقیدے اور مذہب کو جدید زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتا ہے۔" لیکن موصوف ہمیں یہ بتانے سے قاصر رہتے ہیں کہ یہ کام ہو گا کیسے اور ایسے اچھے مسلمانوں کے عقیدے کے کون سے عناصر ناپسندیدہ ہیں؟

غالبا رشید طالب صاحب نے جدید آسائشوں اور مشینوں کے استعمال کو غلطی سے اعتقادی جدید کاری سمجھ لیا ہے۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ جدید ٹکنولوجی اور آلات کے استعمال سے کسی شخص کے عقیدے کا درجہ بلند یا پست نہیں ہوتا۔

رشید طالب صاحب اچھے مسلمانوں کے ذاتی سطح کے سلوک سے بذات خود مطمئن ہیں۔ لیکن جس چیز سے ان کا بلڈ پریشر بڑھتا ہے وہ ہے اسلام کے بنیاد پرست پیروکار جو ان کے نزدیک "برے مسلمان" یا "معمولی مسلمان" ہیں یعنی ہم اور آپ جیسے مسلمان جو اجتماعی سطح پر اسلام کو مکمل عالمی نظام کی بنیاد تصور کرتے ہیں اس سے بڑھ کر ایک باضابطہ ریاستی نظریہ بھی سمجھتے ہیں۔ اور یہ بات نہ صرف رشید طالب جیسے فکر مند انسان کی نگاہ میں بلکہ مغرب اور غیر مسلم مشرق کی نظر میں ایسی ہے جو ایک نئی "شیطانی ریاست" کا خوف ان پر طاری کر دیتی ہے۔

یوں بلی تھیلے سے باہر آ گئی ہے! جناب رشید طالب اور ان کی قبیل کے دوسرے لوگوں کے دلوں پر در اصل اسلام کا سیاسی منشور کچوکے لگا رہا ہے۔ وہ در اصل اپنے آقاؤں کی آواز میں ہی آواز ملا رہے ہیں۔ ان باتوں کی ان کے نزدیک چنداں اہمیت نہیں ہے کہ تمام نظریات عالمی حیثیت کے حامل ہوتے ہیں۔ قوم پرستی کے نظریے کے قدم اکھڑ رہے ہیں اور تیز تر ذرائع آمد و رفت، مواصلات اور معلوماتی سپرہائی وے کی نعمتوں کے طفیل دنیا سمٹ کر ایک بڑا سا گاؤں بنتی جا رہی ہے۔

جب پوری دنیا کے کمیونسٹ ماسکو کی طرف دیکھتے تھے اور اب بیجنگ سے ہدایت و سرپرستی کی لو لگائے ہوئے ہیں، عیسائی روم اور کنٹربری سے رہنمائی کے طالب ہیں۔ حقوق انسانی کے منادی گروہ مغربی داتاؤں سے اپنی قسمتیں وابستہ کیے ہوئے ہیں، تو کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے اور اگر انسانی حقوق کے لئے جہاد کرنے والوں اور لاتعداد غیر سرکاری تنظیموں (NGOs) کو مغربی اصحاب خیر اور "انسانیت" کے ہمدردوں کی شہ ملتی ہے تو اس پر کوئی واویلا نہیں مچتا۔ یہ ساری باتیں طالب صاحب وغیرہ کے تصور عالم میں ذرا سا بھی ارتعاش پیدا نہیں کرتیں۔ لیکن اسلامی وحدت و سالمیت کا دھندلا سا تصور بھی جب فلسطین اور بوسنیا اور دوسرے بہت سے الم ناک سانحوں کی آزمائش میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا ہے، طالب صاحب کے لئے بہت پریشانی کا سبب بنا ہوا ہے۔

طالب صاحب نے بڑی جاں فشانی سے یہ انکشاف کیا ہے کہ سیاسی سطح پر اسلام جدید حقائق سے ہم آہنگ نہیں ہے! اس ناکامی کا سبب وہ اسلام کے تین بنیادی تصورات میں تلاش کرتے ہیں یعنی (الف) متشدد اور ناقابل صلح توحید (ب) اجتماعی سطح پر قرآن کریم کے لفظی معنی پر اصرار (ج) حد درجہ قوم پرستی کے عہد میں امت کا یا عالمی وحدت کا غیر حقیقی شعور۔

اسلام کی ابدیت کا تصور جس سے طالب صاحب سراسیمہ ہیں وہ اسلام کے لئے کوئی "معمہ" یا "مسئلہ" نہیں ہے۔ بلکہ اسی میں اسلام کی قوت مسلسل کا راز پنہاں ہے۔ اسلام کی ابدیت جس دن ختم ہو جائے گی وہی اسلام کی زندگی کا آخری دن بھی ہوگا۔ اسلام کا ابدی پیغام آج بھی اہم ہے۔ یہ بیسویں صدی کے موڑ پر بھی اتنا ہی شاداب ہے جتنا کہ چودہ سو سال پہلے تھا۔

دوسرے لفظوں میں طالب صاحب اسلام اور مسلمانوں کی نفس بنیاد پر ہی ضرب لگا رہے ہیں۔ توحید کے بغیر اسلام کی مثال بے جان جسم کی سی ہے۔ توحید اسلام کی روح ہے۔ اور جب مقدس صحیفوں کی تفسیر و تشریح کا فریضہ طالب صاحب جیسے لوگ انجام دینے لگیں گے تو ایسے مسلمانوں کے ہاتھوں قادیانیت وجود میں آئے گی جو اپنے محدود گروہ کے باہر اپنے دیگر ہم مذہب افراد کے دکھ درد میں شریک ہونے اور ان سے اتحاد و یگانگت کا احساس بھلا بیٹھیں گے۔

یہ بات قابل غور ہے کہ وکالت اور میڈیا کے میدان میں پٹا ہوا اور ناکام شخص آنے والے دنوں میں کس طرح ترقی کی منازل طے کرتا ہے۔ اسلام دشمنی آج ایک بہت مقبول حربہ بن چکا ہے اور ملکی اور غیر ملکی وسائل پر قابض طاقتوں کے پاس ٹکڑوں کی کمی نہیں جو وہ بوقت ضرورت بھوکوں کے سامنے پھینک سکیں۔

مضمون کے آخر میں طالب صاحب نے اپنے ارادوں کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے اور یہ کہہ کر ہندوستانی مسلمانوں کو خوف زدہ کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس سے پہلے کہ انہیں بدلنے پر مجبور کیا جائے بہتر یہ ہے کہ خود بدل جائیں "اہم مسئلہ یہ ہے کہ کیا وہ اپنی مرضی سے خود کو بدلتی ہوئی اقدار اور حالات کے مطابق ڈھالیں گے یا بنیادی حقائق کے دباؤ کے عذاب سے گذرنے کے بعد یہ راستہ اختیار کریں گے"۔ معاملہ بالکل واضح ہے ہندوستانی مسلمانوں سے جو چیز مطلوب ہے وہ یہ ہے کہ وہ اسلام سے منہ پھیر لیں۔ طالب صاحب لکھتے ہیں:

"انہیں اپنے آپ سے اس ضمن میں یہ بنیادی سوال کرنا چاہئے کہ اسلام کے مقدس صحیفوں کو لاثانی اطلاقیت کا حامل کس حد تک سمجھنا چاہئے۔ خصوصاً یہ کہ قرآن اور حدیث کو کس حد تک ہر زمان و مکان کے لئے موزوں اور حرف آخر سمجھا جا سکتا ہے؟ اس سوال کے اطمینان بخش حل کی تلاش ہی ناکامی، زندگی میں تبدیلی کے آہنی قانون کے قبول کرنے میں اسلام کے تامل اور جھجک کی بہت بڑی وجہ ہے۔"

اس طرح رشید طالب صاحب کے خیال میں اصل ضرورت اس بات کی نہیں کہ ہم تعلیم حاصل کریں، اپنے مدارس کی جدید کاری کریں، نئے اسکول اور کالج کھولیں، نئی ٹکنولوجی سیکھیں اور ایجاد کریں، تجارت و معیشت کے میدان میں ترقی کریں، سماجی برائیوں کو دور کریں بلکہ ان کے خیال میں اصل مطلوب یہ ہے کہ حدیث کو جھٹلائیں اور قرآن کو ہر زمانے کے لئے خدا کی ہدایت کے مرتبے سے محروم کر کے اسلام کو یکسر مسترد کر دیں۔ ہمارا یہ عمل ان کے نزدیک ہم پر ترقی کے دروازے اسی طرح کھول دے گا (جیسے کہ اس نے البانیا کے مسلمانوں پر کھولا تھا۔ البانیا خود کو لادین قرار دینے والا دنیا کا واحد ملک تھا۔)

اسلام کی "ابدیت" کا تصور جس سے طالب صاحب سراسیمہ ہیں وہ اسلام کے لئے کوئی "معمہ" یا "مسئلہ" نہیں ہے بلکہ اسی میں اسلام کی قوت مسلسل کا راز پنہاں ہے۔ اسلام کی ابدیت جس دن

(باقی صفحہ 13 پر)

ہند و پاک اور اقوام متحدہ کی تثلیث کے مابین

معلق کشمیری عوام

گذشتہ پانچ برسوں سے سنگینوں کے سائے میں سسکتے کشمیری عوام کے لئے راحت کی کوئی کرن دور دور تک دکھائی نہیں دیتی۔ کیونکہ ہندوستانی فوج اور اور مسلح کشمیری حریت پسندوں کے درمیان دو پاٹوں میں پس رہے کشمیری عوام کی معاشی ابتری اور سیاسی بے چارگی و محرومی روز بروز بڑھتی ہی جارہی ہے۔ 1989 میں صدر راج کے نفاذ کے بعد سے ہی ریاست میں تمام سیاسی سرگرمیاں نہ صرف منجمد ہو کر رہ گئیں ہیں بلکہ دونوں ہی جانب سے "بندوق کلچر" کی سرگرمیاں حاوی ہوتی گئیں نتیجے میں مسئلہ سلجھنے کی بجائے مزید الجھتا چلا گیا۔ مسلح افواج اور "مجاہدین" کے درمیان جاری جنگ میں اب تک سیکڑوں معصوم جانیں تلف ہو چکی ہیں اور لاتعداد افراد جیل کی سلاخوں میں مقید انسانی حقوق سے محروم گھٹ گھٹ کر جینے پر مجبور ہیں۔

گو اس وقت دہلی کے سیاسی ایوانوں میں کشمیر میں انتخابات کرانے سے متعلق سرگوشیاں اور اس مسئلے پر اختلافات و اتفاقات کا بازار گرم ہے لیکن ریاست میں جمہوری حقوق کی بحالی اور سیاسی سرگرمیوں کے آغاز کے امکانات اتنے روشن نظر نہیں آرہے ہیں جتنا کہ بظاہر میڈیا اور دہلی کے سیاسی حلقوں کی جانب سے پیش کرنے کی کوششیں کی جاری ہیں۔ جو لوگ کشمیر کی صورت حال سے واقف ہیں ان کے لئے اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مرکزی حکومت کی جانب سے انتخابات کرانے کے اعادہ کے باوجود ریاست میں امن کے قیام کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔ کل جماعتی تحریک حریت اور دیگر تنظیموں سے وابستہ سرکردہ رہنماؤں کی جیل سے رہائی کی بعد بھی عوامی سطح پر انتخابات کے لئے کوئی جوش یا امنگ دور دور تک دکھائی نہیں دے رہی ہے۔ خود جیل سے رہا کردہ کشمیری حریت پسند رہنما بھی ہندوستانی آئین کے تحت کرائے جانے والے انتخابات میں شرکت کو یکسر خارج از امکان قرار دیتے ہوئے اقوام متحدہ کے ذریعہ انتخابات کرانے اور اس کے نتیجے کو استصواب رائے تصور کرنے کے موقف پر سختی سے اڑے ہوئے ہیں۔ عبدالغنی لون اور گیلانی سے لے کر یسین ملک اور شبیر شاہ تک سبھوں نے انتخابات کے سلسلے میں یکساں موقف اختیار کر رکھا ہے۔

لہذا اب مرکزی حکومت کی ساری امیدیں فاروق عبداللہ اور ان کی پارٹی نیشنل کانفرنس سے وابستہ ہیں۔ گو فاروق عبداللہ نے بھی شروع میں انتخابات میں شرکت کے لئے یہ شرط رکھی تھی کہ حکومت جب تک جموں کشمیر کو وہ محدود خود مختاری جو اسے 1952 تک حاصل تھی واپس نہیں دے دیتی اور مرکزی حکومت ریاست جموں کشمیر کے لئے مناسب معاشی و سیاسی پیکج کا اعلان نہیں کرتی نہ تو وہاں انتخابات کے لئے فضا سازگار ہو سکتی ہے اور نہ ان کی پارٹی نیشنل کانفرنس انتخابات میں حصہ لے گی۔

لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ کانگریس سے فاروق عبداللہ کے پرانے روابط کے سبب مرکزی حکومت کے لئے فاروق عبداللہ کو رام کرنا زیادہ دشوار کام نہیں، کیونکہ فاروق عبداللہ جو کہ صدر راج کے نفاذ کے بعد اپنی سیاسی موت کا اعتراف کرتے ہوئے کشمیر ہی نہیں ہندوستان سے باہر لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ اب دوبارہ اپنے سیاسی ستارے کو چمکتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ انہیں یہ بھی علم ہے کہ وہ اپنے عزائم میں تنہا کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اس کے لئے کانگریس اور مرکزی حکومت کی پشت پناہی اور تعاون اشد ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فاروق عبداللہ کے لہجے میں واضح تبدیلی نظر آرہی ہے، اور اب وہ محدود خود مختاری کی شرط سے انحراف کرتے نظر آرہے ہیں۔

دوسری جانب باخبر ذرائع سے یہ بھی اطلاع ملی ہے کہ جنتادل کے انتشار کے بعد اپنی سیاسی موت سے خائف مفتی محمد سعید جو ان دنوں جنتادل کی پکڑ سے دور کشمیر میں خلوت نشیں ہیں انہیں بھی ریاست کی سیاست میں اپنی قسمت آزمانے کا سنہری موقع ہاتھ آتا دکھائی دے رہا ہے۔ کیونکہ وہ بھی کانگریس کے ساتھ اپنی وابستگی کے حوالے سے دوبارہ داخلے کی تگ و دو میں مصروف ہیں۔ چونکہ انہیں اپنی سیاسی بساط کا اندازہ ہے اس لیے وہ وزارت عظمٰی کی بجائے مرکزی حکومت اور کانگریس کی خوشنودی کے ذریعہ گورنری کے عہدے پر فائز ہونے کے اپنے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ مفتی محمد سعید کا کانگریس میں داخلہ کانگریس کے لیے کتنا مفید ثابت ہو گا۔ اور اسی پر منحصر کرے گا مفتی محمد سعید کا مستقبل۔ کیونکہ فاروق عبداللہ ہوں یا مفتی محمد سعید اس وقت کشمیری عوام میں ان کی کوئی ساکھ نہیں ہے۔ ان تمام روایتی اور خاندانی سیاست دانوں کی بساط پلٹ چکی ہیں۔

اس لئے سوال یہ ہے کہ فاروق عبداللہ اور مفتی محمد سعید کے بل بوتے پر کیا مرکزی حکومت کشمیر میں انتخابات کے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکے گی۔ بالفرض اگر کشمیر میں انتخابات ہو بھی گئے اور فاروق عبداللہ اور کانگریس کی مشترکہ حکومت قائم ہو بھی گئی تو کیا وہ حکومت واقعی عوام کی نمائندہ حکومت ہوگی؟ کیونکہ اگر عوامی سطح پر انتخابات میں کسی دلچسپی کا اظہار نہیں ہوا اور حریت پسند رہنماؤں نے انتخابات میں شرکت سے انکار کردی تو کیا ایسی منتخبہ حکومت اس حکومت سے مختلف ہوگی جو صدر راج کی صورت میں جموں و کشمیر میں 1989 سے قائم ہے اور اگر مختلف نہیں ہوگی تو ایسے انتخابات اور سیاسی عمل کا کیا کوئی مطلب رہ جائے گا؟ مبصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ مرکزی حکومت کی جانب سے کشمیر میں انتخابات کرانے کے شور و غوغے کے پیچھے اصل محرک ان دنوں نیویارک میں اقوام متحدہ کے جاری اجلاس میں پاکستان اور دیگر اسلامی ممالک کے ذریعے مسئلہ کشمیر پر پیش کیا جانے والا قرار داد ہے جس میں اقوام متحدہ سے مسئلہ کشمیر پر ہندوستان اور پاکستان کے درمیان ثالثی کا مطالبہ شامل ہے۔ ہندوستان کو یہ اندیشہ ہے کہ اگر اسلامی ممالک کے ذریعہ مسئلہ کشمیر پر مجوزہ قرار داد پیش کیا گیا اور اقوام متحدہ میں اس قرار داد کو حمایت مل گئی تو کشمیر کا مسئلہ بین اقوامی مسئلہ بن جائے گا۔ جس سے ہندوستان کو شدید نقصان کا خطرہ لاحق ہوگا، علاوہ بریں انسانی حقوق کی پامالی اور سیاسی و جمہوری عمل کے انجماد کے مسئلے پر پاکستان اور دیگر بین اقوامی انسانی حقوق کمیٹیوں کی جانب سے انگشت نمائی کے سبب عالمی برادری کے سامنے ہندوستان کو اس وقت جس مدافعانہ صورت حال کا سامنا ہے۔ انتخابی عمل کے آغاز سے اس کا تدارک کرنے میں ہندوستان کو آسانی ہوگی۔

سیاسی مبصرین کا یہ بھی کہنا ہے کہ مرکزی حکومت اور اس کی کابینہ کے مابین بھی کشمیر میں انتخابات کرانے کے سوال پر زبردست اختلافات موجود ہیں۔ اور خود مرکزی حکومت اس سلسلے میں کوئی واضح پالیسی وضع کرنے میں ناکام ہے۔ اس خیال کی تصدیق مرکزی وزیر داخلہ مسٹر چوہان اور وزیر مملکت برائے داخلی امور مسٹر راجیش پائلٹ کے مابین چپقلش اور اس چپقلش کے نتیجے میں وزیر اعظم نرسمہا راو کے ذریعے کشمیر سے متعلق امور کو خود اپنی تحویل میں لینے کے عمل سے بھی ہوتی ہے۔ لیکن مسئلہ کشمیر سے متعلق کسی واضح پالیسی کے بغیر مسئلہ کشمیر کا ایک وزارت سے دوسری وزارت میں منتقلی محض سے کسی مثبت پیش رفت کی امید نہیں بندھتی۔ لازم ہے کہ مرکزی حکومت کشمیری عوام کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ایسی پالیسی وضع کرے جس سے صحیح معنوں میں کشمیر میں امن و امان کا قیام ممکن ہو سکے۔

❀❀❀❀

> گو اس وقت دہلی کے سیاسی ایوانوں میں کشمیر میں انتخابات کرانے سے متعلق سرگوشیاں اور اس مسئلے پر اختلافات و اتفاقات کا بازار گرم ہے۔ لیکن ریاست میں جمہوری حقوق کی بحالی اور سیاسی سرگرمیوں کے آغاز کے امکانات ... جو لوگ کشمیر کی صورت حال سے واقف ہیں ان کے لئے یہ اندازہ لگانا دشوار نہیں کہ مرکزی حکومت کی جانب سے انتخابات کرانے کے اعادہ کے باوجود ریاست میں امن کے قیام کی کوئی صورت نظر نہیں آرہی ہے۔

> مسئلہ کشمیر سے متعلق کسی واضح پالیسی کے بغیر اس کے حل کے لئے کسی مثبت پیش رفت کی امید نہیں بندھتی۔ لہذا مسئلہ کشمیر کے خاطر خواہ حل کے لئے لازم ہے کہ مرکزی حکومت کشمیری عوام کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ایسی پالیسی وضع کرے جس سے صحیح معنوں میں کشمیر میں امن و امان کا قیام ممکن ہو سکے۔

> مرکزی حکومت اور کابینہ میں کشمیر میں انتخابات کے سوال پر زبردست اختلافات ہیں اور خود حکومت اس سلسلے میں کوئی واضح پالیسی وضع کرنے میں ناکام ہے، اس کی تصدیق وزیر اعظم کے ذریعے کشمیر سے متعلق امور کو اپنی تحویل میں لینے کے عمل سے ہو جاتی ہے۔ لازم ہے کہ مرکزی حکومت کشمیری عوام کی خواہشوں کا احترام کرتے ہوئے ایسی پالیسی وضع کرے جن سے امن و امان قائم ہو سکے۔

ایک جواں سال شہید بیٹے کی قبر پر اس کا فریادی باپ

الجزائر میں مسلم انقلابیوں سے مفاہمت کی کوشش

مراقش کے عوام اسے الجزائر کی دوسری جنگ کا نام دیتے ہیں۔ جنگ آزادی میں پانچ سے دس لاکھ افراد کی قربانی کے مقابلے میں دس یا بیس

> امریکہ اور کسی قدر تاخیر سے فرانس متحارب گروہوں میں مفاہمت کی کوششوں کی ہمت افزائی کرتے رہے ہیں۔ ان کوششوں کی شروعات اسلامک سالویشن فرنٹ کے دو لیڈروں عباسی مدنی اور علی بلحاج کی حراست کو نظربندی میں تبدیل کرنے اور ان کے دو ساتھیوں کی رہائی سے ہوئی ہے۔

ہزار مرنے والوں کی تعداد بہت ہی مختصر ہے۔ تاہم الجزائر کی موجودہ کشمکش میں فریقین کی جانب سے بڑھتی ہوئی خونریزی اور سفاکی مستقبل کی خوفناک صورت حال کی غمازی کر رہی ہے۔ اس وقت مشرقی سہارا کے کیمپوں میں تین ہزار اور ملک کے مختلف مقامات پر تیس سے پچاس ہزار افراد قیدی بنا کر رکھے گئے ہیں جہاں انہیں ہر روز اذیتیں دی جاتی ہیں۔ اسی کے شانہ بشانہ اسلامی طاقتیں الجزائر کے ممتاز دانشور طبقے کو اپنی دہشت گردی سے خائف کرنے میں کامیاب ہو گئی ہیں۔ اب تک اٹھارہ صحافی اور اڑتالیس معلم قتل کئے جا چکے ہیں۔ ہر وہ شے یا فرد جسے غیر اسلامی قرار دے دیا جائے اسے موت کی دھمکیاں ملنے لگتی ہیں۔

الجزائر کے اس بحران کے حل کے لئے کسی حقیقی ابتدائی امکان کا خیر مقدم یقینا بڑی فراخدلی سے کیا جاسکتا ہے۔ لیکن امن کا راستہ مصائب سے بھرا ہوا ہے۔ ملک میں ایسے شدت پسند عناصر موجود ہیں جو دونوں جانب کی قیادتوں کے درمیان کسی مصالحت کے سخت مخالف ہیں۔ یہاں تک کہ اگر اعتدال پسند حلقے کو بالادستی حاصل بھی ہو گئی تو یہ بات یقین سے بہت پرے ہے کہ وہ مستقبل کے لیے کسی قابل قبول لائحہ عمل پر اظہار اتفاق کریں گے۔ بہر حال اس مسئلے کا کوئی آسان حل نظر نہیں آتا۔ قلیل مدتی یا فوری جمہوریت کے قیام کی کوشش کی گئی تھی جو 1922 میں ناکام ہو گئی۔ اس لئے بعینہ اسی شکل میں اس کا احیاء کچھ مناسب نہ ہوگا۔ اسلامک سالویشن فرنٹ کے (جبهة الانقاذ الاسلامی) کے دو لیڈروں میں سے ایک علی بلحاجی انتخابات کی منسوخی کی مذمت کرتے ہیں جس سے ان کی تحریک اقتدار میں آسکتی تھی لیکن وہ جمہوریت کو

> فرانسیسی حکومت جو الجزائر کے معاملات میں براہ راست دلچسپی رکھتی ہے ایک طرف اسلامی جدو جہد سے خائف ہے اور دوسری جانب اسے یہ خوف بھی لاحق ہے کہ خانہ جنگی کے جاری رہنے کی صورت میں، بحر روم کی طرف ترک وطن کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو روکنا ناممکن ہو جائے گا۔

پھر بھی اسلام کے لئے اجنبی اور ناآشنا تصور کرتے ہیں۔

اس صورت حال کا سب سے زیادہ حوصلہ افزا پہلو یہ ہے کہ دونوں جانب کے اعتدال پسند افراد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وہ پوری طرح فتحمند نہیں ہو سکتے۔ اسلام پسندوں کی امید کے بر خلاف فوج کی صفوں میں ابھی انتشار پیدا نہیں ہوا ہے۔ صرف مسلح اسلامی گروہ (آرمڈ اسلامک گروپ) کا ہی یہ خیال ہے کہ اسلامی ریاست اگر قائم ہو سکتی ہے تو ہتھیار سے ہو سکتی ہے۔ اسلامک سالویشن فرنٹ کا نظریہ یہ ہے کہ موجودہ حکومت کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے۔ تاہم وہ زندگی کی ایسی حقیقت ہے جس سے نبرد آزما ہونا بھی ضروری ہے۔ لیکن فوج اخلاقی گراوٹ کا شکار ہو رہی ہے۔ جوج کے سربراہ جنرل محمد لاماری کی قیادت میں صدر زیرول اور ان کے مشیر قتل و غارت گری مچانے والوں پر حاوی ہونے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ جنرل لاماری کا خیال ہے کہ اسلامی دہشت گردوں کا صفایا کیا جاسکتا ہے۔

امریکہ اور کسی قدر تاخیر سے فرانس متحارب گروہوں میں مفاہمت کی کوششوں کی ہمت افزائی کرتے رہے ہیں۔ ان کوششوں کی شروعات

الجزائر کے مسلم انقلابیوں کے عزائم سے حکومت گھبرا اٹھی

اسلامک سالویشن فرنٹ کے دو لیڈروں عباسی مدنی اور بلحاجی کی حراست کی نظربندی میں تبدیلی اور ان کے دو دیگر ساتھیوں کی رہائی سے ہوئی ہے۔ لیکن ایران کے اسلامی انقلاب میں شاہ کی حکومت کے زوال کی پیش بینی میں اپنی ناکامی سے امریکہ نے بنیادی سبق حاصل کیا ہے۔ فرانسیسی حکومت جو الجزائر کے معاملات میں براہ راست دلچسپی رکھتی ہے ایک طرف اسلامی انتہا پسندی سے سے متنفر ہے اور دوسری جانب اسے یہ خوف بھی لاحق ہے کہ خانہ جنگی کے جاری رہنے کی صورت میں بحر روم کی طرف ترک وطن کے بڑھتے ہوئے دباؤ کو روکنا ناممکن ہو جائے گا۔

اس میں شک نہیں کہ اس یقین کے ساتھ کہ حالات و واقعات اپنی مخصوص ڈگر پر جارہے ہیں اسلامک سالویشن فرنٹ کے لیڈر خم ٹھونک کر میدان میں اتر آئے ہیں۔ انہوں نے ایسی تمام تجاویز مسترد کر دی ہیں کہ انہیں قانونا تسلیم شدہ مخالف جماعتوں کے ساتھ حکومت کی سطح پر گفت و شنید میں شریک ہونا چاہئے۔ ان کا کہنا ہے کہ مجاہدین کو اسلامک سالویشن فرنٹ کی مجلس شوری میں شمولیت ملنی چاہئے اور کسی نئی اور جائز الجزائری قیادت کے انتخاب سے پہلے اسے ایک غیر جانب دار حکومت کی تشکیل کا مطالبہ کرنا چاہئے۔ فوجی شدت پسند ان مطالبات کو خود ہتھیار ڈالنے کی آمادگی پر محمول کر رہے ہیں اور اب بھی مفاہمت کی بات کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ خوش قسمتی سے یہ مسئلہ اتنا سیدھا اور واضح نہیں ہے۔ خصوصاً عباس مدنی ایک ایسے شخص ہیں جن میں مفاہمت کی صلاحیت ہے اور آرمڈ اسلامک گروپ میں بھی ایسے عناصر ہیں جو گفتگو میں اس کے شروع ہو جانے کے بعد بھی شریک ہونے کو تیار ہیں۔ عالم عرب اور عالم اسلام کے علاوہ یوروپ کے لئے ان واقعات کی جو اہمیت ہے اس میں کسی مبالغہ آرائی سے کام لینا مشکل ہے۔ سوڈان کے اسلامی انقلاب کے رہنما اور فعال ترین شخصیت حسن ترابی کی پیشین گوئی کے مطابق اسلامی مطلق العنانی کا سیاسی نظریہ مراقش تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیگا۔ بحر روم کے شمال میں واقع علاقہ کو ہی سبز خطرہ سے تعبیر نہیں کیا جانا چاہئے۔ ابھی تک ترابی پر امید نظر آتے ہیں۔ سوڈان کو بنیاد پرستی کا قلب کہا جاسکتا ہے اس ضمن میں اسے خصوصیت حاصل ہے۔ جب تک کرنل قذافی زندہ ہیں لیبیا اپنے خود پسندانہ نظریات پر قائم رہے گا۔ مراقش اور تیونس اسلامی انتہا پسندی پر پوری طرح قابو پائے ہوئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تیونس لیڈروں کو یہ کہتے ہوئے خاصا تامل ہوتا ہے کہ اسلامی انتہا پسندی کی طرف سے انہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ مراقش کے لئے یہ بات باعث اطمینان ہے کہ اسے ایک ایسے تجربہ کار اور ذی فہم حکمراں کی سرپرستی حاصل ہے کہ مسلمانوں کے قائد کی حیثیت سے ان کے اسلامی مرتبے کو مراقشی عوام کی اکثریت تسلیم کرتی ہے۔

تاہم الجزائر کے تجربے سے ہر عرب حکومت کو سبق لینا چاہئے۔ ان میں سے ایک بات یہ بھی ہے کہ تیل کی دولت جو آج نعمت بنی ہوئی ہے وہی لعنت بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ مراقش اور تیونس میں بد عنوانی اور بد نظمی ہو سکتی ہے لیکن تیل سے ہونے والی آمدنی کے فقدان نے انہیں اپنے وسائل کے بھروسے پر ترقی کی جانب قدم

باقی ص11 پر

کیا اشعری محمد اور ملیشیا کی حکومت میں کوئی خفیہ سودے بازی ہوگئی ہے؟

الارقم کے رہنما اشعری محمد نے مسیح موعود سے متعلق اپنے "عقائد" یا خیالات تبدیل کرلیے ہیں۔ ملیشیا کی سپریم مذہبی کونسل کے سامنے 20 اکتوبر کو انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ مسیح سے متعلق ان کی تعلیمات غلط تھیں۔ محض یہ کہہ دینے کے بعد انہیں صحیح العقیدہ قرار دے دیا گیا۔ ظاہر ہے اس کے بعد ملیشیائی حکومت کے پاس انہیں جیل میں رکھنے کا کوئی جواز نہیں تھا۔ چنانچہ گذشتہ اکتوبر کے آخری دنوں میں انہیں جیل سے رہا کردیا گیا۔

جیل سے رہا ہونے کے بعد اپنے پہلے ٹیلیویژن خطاب کرتے ہوئے اشعری محمد نے الارقم کو تحلیل کردیا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ تنظیم کا خاص لباس یعنی سبز عبا، پہننا چھوڑ دیں۔ اسی کے ساتھ انہوں نے یہ اعتراف بھی کیا کہ الارقم عوامی فلاح و بہبود کے لئے ایک خطرہ ہے۔ لیکن انہوں نے ملکی قوانین کے مطابق تنظیم کی تجارتی سرگرمیوں کو جاری رکھنے کو کہا۔

الارقم کے تقریباً ایک لاکھ ماننے والے ملیشیا میں موجود ہیں۔ الارقم کے ممبر زیادہ تر مڈل کلاس سے تعلق رکھنے والے پڑھے لکھے لوگ ہیں جن میں یونیورسٹی اساتذہ، وکلاء، ڈاکٹر، سرکاری افسران، ریٹائرڈ فوجی افسران اور چھوٹے بڑے بہت سے سیاستداں شامل ہیں۔ الارقم کی اپنی ایسی 48 بستیاں ہیں جہاں ان کی ضرورت کی ہر چیز میسر ہوتی تھی۔ 250 سے زائد اسکول چلانے کے علاوہ الارقم کی تجارت 115 ملین امریکی ڈالر سے زیادہ کی ہے۔

یہ بات واضح ہے کہ اشعری محمد کو گرفتار کرنے کی وجہ سیاسی زیادہ اور مذہبی کم تھی۔ ان پر لگائے گئے الزامات کی شرائط بے بنیاد تھے۔ ہاں مسیح موعود سے متعلق صرف ان کی بات ناقابل فہم تھی کہ ان کا ظہور جنوب مشرقی ایشیا سے ہوگا کیونکہ کسی حدیث میں کسی علاقے کا تعین نہیں کیا گیا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ اشعری محمد حکومت کے تشدد کو برداشت نہ کرسکے۔ یا پھر ایک حکمت عملی کے تحت انہوں نے سردست حکومت سے تصادم سے گریز کرنے ہی میں عافیت سمجھی۔ کیونکہ حکومت نے اپنے اثر و رسوخ کے ذریعہ نہ صرف ملیشیا بلکہ علاقے کے دوسرے ممالک میں بھی ان کے لئے مسائل پیدا کردیئے تھے۔ ممکن ہے اس صورتحال میں انہوں نے یہ سوچا ہو کہ تصادم سے سوائے نقصان کے اور کچھ نہیں ملے گا۔ لیکن بعض خصوصی شعائر اور خیالات جن پر ان کا ایمان کی حد تک اعتقاد تھا، اگر ان کو ترک کردینے سے انہیں اپنے معاشی پروگرام کو جاری رکھنے کی اجازت مل جاتی ہے تو بعد میں وہ اور بھی بہت کچھ حاصل کرلیں گے

ایک تیسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ حکومت اور اشعری میں درپردہ کوئی مصالحت طے پا گئی ہو کیونکہ ماثر محمد کے اقدام کو خود ان کی پارٹی کے بعض ممبروں، اپوزیشن جماعتوں، حقوق انسانی کی علمبردار تنظیموں اور یہاں تک کہ بعض مذہبی شخصیات نے بھی ہدف تنقید بنایا تھا۔ ظاہر ہے حکمراں پارٹی اس زبردست تنقید کے لئے تیار نہیں تھی۔ چنانچہ اس نے سوچا ہو کہ اشعری سے سودے بازی مناسب رہے گی۔ پس اس بات پر مصالحت طے پاگئی ہو کہ اشعری محمد معاشی سرگرمیاں تو جاری رکھیں لیکن ایسی باتیں یا کام نہ کریں جن سے حکمراں پارٹی کے چینی نسل کے لوگوں میں بے اطمینانی پیدا ہوتی ہے۔ دراصل چینیوں کو اشعری کی معاشی سرگرمیوں اور ترقیوں کی طرف سے فکر تھی مگر یہ بات وہ کھل کر کہہ نہیں سکتے۔ اس لئے وہ الارقم کے ممبران کے لباس وغیرہ پر اعتراض کرتے تھے کہ اس سے سماج میں تفاوت پیدا ہوسکتا ہے۔ چنانچہ حکومت نے مصالحت کے تحت ممکن ہے اشعری کو راضی کرلیا ہو کہ ان کے تاج دار سبز عبا پہننا چھوڑ دیں۔

لیکن یہ تینوں وجہیں قیاس آرائی پر مبنی ہیں۔ مگر ان قیاس آرائیوں کی بہرحال بڑی مضبوط بنیادیں ہیں۔ ایسے نظریے جو پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہوں، راتوں رات بدل نہیں جاتے۔ یا تو کمزور قسم کے لوگ دباؤ میں آکر اپنے نظریے بدل لیتے ہیں، یا وقتی طور پر کسی حکمت عملی کے تحت حالات سے مصالحت کرلیتے ہیں یا غالب گروہ سے کسی سمجھوتے کی وجہ سے اپنے بعض خیالات کو ترک کردیتے ہیں۔

بہر حال صحیح صورتحال کا پتہ لگانا سردست ممکن نہیں ہے۔ ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ چینیوں کو اس حد تک ضرور کامیابی ملی ہے کہ وہ حکومت کو الارقم کے خلاف ورغلانے میں کامیاب ہوگئے۔ مگر سب سے بڑی کامیابی وزیر اعظم ماثر محمد کو ملی جنہوں نے اپنے خلاف ابھر رہی واحد قابل لحاظ اپوزیشن کو تشدد یا مصالحت کے ذریعہ اگر ختم نہیں کیا تو کم از کم جھکا لیا ہے۔

ماثر محمد اور اشعری محمد کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

حماس کے خلاف اسرائیلی تشدد جاری رہا تو مغربی ایشیا کا امن درہم برہم ہو جائے گا

گذشتہ اکتوبر میں بم دھماکوں اور اغوا جیسے واقعات کے بعد جن میں کئی اسرائیلیوں کو موت کا منہ دیکھنا پڑا۔ اسرائیلی حکومت بوکھلا سی گئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ امن مذاکرات تو جاری رہیں گے لیکن اسی کے ساتھ حماس کے خلاف بڑے پیمانے

"عزالدین القسام ہر جگہ اور ہر وقت" حماس کا ایک بینر

پر کارروائی کی جائے گی۔ بڑے منظم انداز میں اسرائیلی خفیہ ایجنسی موساد کے افسروں نے پریس کو یہ خبر دی ہے کہ وہ ایک بار پھر حماس کے کارکنوں پر دھاوا بولنے والے ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ تشدد کے مزید واقعات رونما ہوں گے۔ حماس کے کارکنوں کو یا تو جیلوں میں ٹھونس دیا جائے گا جہاں ان پر تشدد کیا جائے گا۔ یا پھر انہیں سرے سے گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ موساد کے ذرائع کے مطابق حماس کے ان کارکنوں کو جو مغربی کنارے پر رہتے ہیں اور جن کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ وہ اس تنظیم کے سرگرم کارکن

> القسام بریگیڈ کے سرفروشوں کو حماس کی لیڈر شپ کی طرف سے احکام ملتے ہیں جو مغربی کنارے وغیرہ پٹی سے باہر یعنی اردن، شام، لبنان، سوڈان اور ایران وغیرہ میں رہتے ہیں۔ موساد کے ایجنٹوں کو انہیں ٹھکانے لگانے کا حکم دے دیا گیا ہے۔

ہیں ان پر سب سے زیادہ قہر نازل ہونے والا ہے، خفیہ ایجنٹوں کو واضح احکام جاری کئے گئے ہیں کہ حماس اور اور اسلامی جہاد کے کارکنوں پر گولیاں چلائی جاسکتی ہیں۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ حماس کے کارکن چیلنج کئے جانے کے بعد اگر فورا خود کو اسرائیلی پولس کے حوالے نہیں کرتے تو انہیں گولیوں سے بھون دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ یہ حکم بھی جاری کیا گیا ہے کہ حماس اور اسلامی جہاد کے ان کارکنوں پر جو جیلوں میں بند ہیں مزید تشدد کیا جائے تا کہ وہ اس تنظیم کے خفیہ ٹھکانوں کے بارے میں اطلاعات فراہم کرسکیں۔

موساد کے خفیہ ذرائع کے مطابق اسرائیلی ایجینٹ حماس کی فوجی ونگ عزالدین القسام بریگیڈ کے تقریبا 80 جانے مانے ممبروں کو تلاش کر رہے ہیں۔ تل ابیب کے بس دھماکہ کے بعد تقریبا سو فلسطینیوں کو گرفتار کرلیا گیا ہے جن کے بارے میں اسرائیلیوں کا شبہ ہے کہ ان کا القسام بریگیڈ سے تعلق ہے یہ واضح کئے جانے پر کہ بلاوجہ بڑے پیمانے پر گرفتاریاں جائز نہیں ہیں ایک اسرائیلی افسر نے کہا "ہم درخت ہلا رہے ہیں یہ دیکھنے کے لئے کہ اس سے کیا ٹپکتا ہے"۔

بظاہر درخت ہلانے جیسے ادبی اظہار خیال کے پیچھے ایک بھیانک تصور کار فرما ہے۔ اسرائیلی قانون کے مطابق تفتیش کاروں کو "معتدل جسمانی دباؤ" یعنی ہلکے تشدد کا حق حاصل ہے۔ تشدد کی انتہا کی شکل صرف اس صورت میں قانونا جائز ہے جب اس کے علاوہ کوئی چارہ نہ رہ گیا ہو۔ مثلا خفیہ ایجینٹوں کو یہ پتہ چلا ہو کہ فلسطینی کہیں کوئی حملے کا پروگرام بنا رہے ہیں یا کہیں ٹائم بم رکھا ہوا ہے جس سے بڑے پیمانے پر جانی و مالی نقصان ہوگا تو جیل میں بند فلسطینیوں پر تشدد کی انتہا کی جاسکتی ہے تا کہ ان سے اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے مزید اطلاعات فراہم کی جاسکیں۔ تل ابیب بم دھماکے کے بعد حماس اور اسلامی جہاد کے کارکنوں کو تفتیشی مراکز پر اسرائیل کے نام نہاد "معتدل جسمانی دباؤ" کا مسلسل سامنا ہے۔ یعنی اس واقعہ کے بعد ان پر مسلسل تشدد جاری ہے۔

"معتدل جسمانی دباؤ" کا یہ مطلب ہے کہ حراست میں لیے گئے فلسطینیوں کو سونے نہ دیا جائے انہیں کھانے کو کچھ نہ دیا جائے اور انہیں نہایت تنگ تاریک کمروں میں رکھا جائے۔ اس اسٹیج پر مار پیٹ کی اجازت نہیں ہے۔ اگرچہ کبھی کبھار منہ پر تھپڑ مار دیا جاتا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ انتہائی صورت حال میں جب تشدد کی کسی بھی انتہا کو چھوا جاسکتا ہے کس نوعیت کا ظلم و ستم روا رکھا جاتا ہے۔ ہاں یہ بات سب پر عیاں ہے کہ اسرائیلی اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کو توڑنے میں ماہر ہیں۔ ماضی میں رہا کئے گئے فلسطینی قیدیوں نے اپنے جسموں پر تشدد کے نشانات پریس والوں کو دکھایے ہیں اور کتنے ہی تشدد کی تاب نہ لاکر جیلوں میں جاں بحق ہوگئے۔ خود اسحق رابن نے پچھلے دنوں غیر متوقع طور پر اسرائیلی جیل میں تفتیشی تشدد کے نتیجے میں ایک فلسطینی کی موت واقع ہو جانے کا اعتراف کیا۔ یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب ویکس مین کے اغوا کے بعد موساد کے ایجنٹ حراست میں لیے گئے فلسطینیوں پر مزید اطلاعات کے لئے تشدد کر رہے تھے۔ القسام کے 27 سرگرم کارکنوں کے بارے میں اسرائیلیوں کو پتہ ہے اور ان کا اندازہ ہے کہ مغربی کنارے پر ایسے اور بھی ہیں جن کے بارے میں انہیں کچھ معلوم نہیں۔ ان مطلوبہ افراد کی فہرست میں 28 سالہ یحیی عیاش سب سے اوپر ہے۔ اسرائیلیوں کا خیال ہے کہ عیاش ہی نے وہ طاقتور بم بنایا تھا جس سے ایک فلسطینی جاں باز نے تل ابیب میں ایک بس کو اڑا دیا دیا تھا اگر خفیہ ایجنسیاں عیاش اور دوسروں کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتی ہیں تو اوپر بیان کئے گئے نئے تفتیشی قوانین لاگو ہوں گے۔ ماضی میں اسرائیلی فوجیوں کو گولی مارنے کی صرف اسی صورت میں اجازت تھی جب یا تو ان کی اپنی زندگی کو خطرہ ہو یا فرار ہونے والا مشتبہ فرد ان کی وارننگ پر رکنے سے انکار کردے۔ نئے قوانین کے مطابق القسام کے جانے مانے کارکنوں پر فورا گولی چلائی جا سکتی ہے۔ یہ جانے بغیر کہ آیا ان کے پاس ہتھیار ہے یا نہیں۔ لیکن بعض دوسرے افسر یہ کہتے ہیں کہ وہ ایسے سرگرم کارکنوں کو گولیوں سے بھون دینے کے بجائے زندہ گرفتار کرنا زیادہ پسند کریں گے کیوں کہ ان لوگوں سے ضروری اطلاعات حاصل کی

> حماس کے کارکنوں کو گرفتار کرنا یا گولیوں سے بھون دینا آسان نہ ہوگا۔ یہ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹے ہوئے لوگ انتہائی پڑھے لکھے سمجھدار اور فوجی اعتبار سے انتہائی تربیت یافتہ ہیں۔ بزدلانہ انداز میں خود کو حوالے کرنے کے بجائے مقابلہ کرنا وہ زیادہ پسند کریں گے۔

باقی صفحہ 10 پر

امریکہ اور اسرائیل کی جانب سے حماس کو ختم کرنے کا عرفات کو حکم مگر...

فلسطینی پولیس کی اکثریت حماس کے خلاف جارحانہ کارروائی کی مخالف

وسط اکتوبر 1994 میں تل ابیب میں ایک بس پر بم دھماکہ اور اس سے قبل ایک اسرائیلی فوجی کا اغوا اور اس کی موت کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا تھا جیسے اسرائیل اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا ہے۔ اس نے پہلے تو پی ایل او سے اپنے مذاکرات ایک محدود وقت کے لئے منقطع کردیئے اور پھر غازہ پٹی کی ناکہ بندی کردی لیکن اس سے بھی بڑھ کر اس نے یاسر عرفات سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ حماس کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کا اہتمام کریں۔ رابن نے بڑے غرور سے کہا کہ عرفات حماس اور امن میں سے جس کا چاہیں انتخاب کرلیں۔

امریکی صدر بل کلنٹن اسرائیل کے زبردست حامی ہیں۔ انہوں نے رابن کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے تقریبا یہی بات کہی بلکہ یاسر عرفات کو مصر بلا کر ان سے بر سر عام یہ اعلان کروایا کہ وہ امن چاہتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اب حماس کے خلاف امریکہ و اسرائیل کے اشارے پر صف آرا ہونا چاہتے ہیں۔

رابن اور کلنٹن کا عرفات سے حماس کو ختم کرنے کا مطالبہ تقریبا ناقابل فہم ہے۔ خصوصا رابن اور اسرائیلی لیڈروں کے منہ سے یہ بات ذرا بھی نہیں بھاتی۔ تحریک انتفاضہ کے دوران اسرائیل اپنے بدنام زمانہ جاسوسی ادارے اور زبردست فوج کی مدد کے باوجود حماس کو ختم نہیں کرسکا۔ اب آخر وہ کس منہ سے عرفات سے مطالبہ کر رہا ہے کہ وہ 11 ہزار پولس کی مدد سے یہ کام انجام دیں سچ تو یہ ہے کہ اگر عرفات نے ایسا کوئی احمقانہ قدم اٹھایا تو انہیں انجام کار کف افسوس ہی ملنا پڑے گا۔ نہ صرف یہ کہ وہ اور ان کی گیارہ ہزار نفری پولس حماس کو ختم کرنے میں ناکام رہے گی بلکہ سیاسی سطح پر بھی انہیں زبردست ہزیمت اٹھانی پڑے گی۔ غازہ کا عام آدمی اب یہ محسوس کرنے لگا ہے کہ محدود خود مختاری سے انہیں معاشی طور پر کوئی فائدہ نہیں پہونچا ہے۔ کئی بلین ڈالر کا دنیا اور خصوصا مغربی ممالک نے جو وعدہ کیا تھا، اس کا عشر عشیر بھی ابھی تک نہیں ملا ہے جس کی وجہ سے نئی نوکریاں اور اسامیاں نہیں نکل رہی ہیں۔ غازہ پٹی کے فلسطینی یہ بھی محسوس کر رہے ہیں کہ مغربی کنارے پر خود مختاری کا معاملہ تقریبا کھٹائی میں پڑ گیا ہے ایسے احساسات اور جذبات کی موجودگی میں اگر عرفات کی پولس حماس کے کارکنوں کو گرفتار کرتی یا ان پر مظالم ڈھاتی ہے تو ہر کوئی یہی کہے گا کہ عرفات اسرائیل کا "گندا کام" کر رہے ہیں۔

غالبا یاسر عرفات کو خود بھی اس کا احساس ہے کہ حماس کے خلاف کوئی بھی کارروائی ان کے لئے نقصان دہ ہوگی۔ خود ان کی اپنی پولس میں بے شمار افراد ہیں جو حماس کے خلاف کسی جارحانہ اقدام کی حمایت نہیں کرتے۔ چند ماہ قبل ایک اسرائیلی کو موت کے گھاٹ اتار دینے کے جرم میں فلسطینی پولس نے اسلامی جہاد کے پچاس سے زائد کارکنوں کو گرفتار کرلیا۔ گرفتاری کے دوسرے دن ان کی رشتہ دار خواتین، جن کی تعداد تقریبا دو سو تھی، نے پولس ہیڈ کوارٹر پر مظاہرہ کیا۔ ایک معمر خاتون نے ایک پولس افسر کو جب یہ طعنہ دیا کہ یہ ان گرفتار شدگان کی قربانیاں ہیں جن کی وجہ سے تم یہاں موجود ہو تو وہ رونے لگا اور وعدہ کیا کہ وہ انہیں بہت جلد رہا کردے گا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خود فلسطینی پولس کو اس کا اعتراف ہے کہ ان کی طرح حماس اور اسلامی جہاد کے کارکنوں نے بھی اسرائیل کے خلاف جد و جہد میں بھرپور حصہ لیا ہے۔

> ایک عام اندازے کے مطابق حماس کو غزہ پٹی کے تقریبا پچاس فیصد لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس طرح سیاسی اور فوجی سطح پر بھی وہ بہت ہی مضبوط ہے فلسطینی پولس کا بھی خیال ہے کہ حماس کے ارکان نے بھی انکے ساتھ فلسطین کی جد و جہد میں حصہ لیا ہے اس لئے ان کی اکثریت حماس کے کارکنوں کے خلاف جارحانہ کارروائی کی حمایت نہیں کرتی۔

باقی صفحہ 15 پر

ہندوستان اور اسرائیل کے درمیان بڑھتے تعلقات

دہلی، کلکتہ اور بمبئی اسرائیلی سیاحوں کے پسندیدہ مقامات بن جائینگے

سیاحت کا فروغ ہند اسرائیل تعلقات کے صرف ایک پہلو کو واضح کرتا ہے۔ 92 تک دونوں میں سفارتی تعلقات نہیں تھے لیکن 32 مہینوں کے بعد یہ تعلقات بہت گہرے اور قریبی ہوگئے ہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ بمبئی، کلکتہ اور دہلی اسرائیلی سیاحوں کے عنقریب پسندیدہ مقامات بن جائیں گے۔ حالیہ طاعون کی وبا کی خبریں بھی لگتا ہے اسرائیلیوں کے ہندوستان سے متعلق جذبات کو سرد نہیں کر پائی ہیں۔ چنانچہ امسال تل ابیب میں واقع ہندوستانی سفارتخانہ تقریباً 15 ہزار اسرائیلیوں کو ویزا جاری کرنے والا ہے۔ اس پس منظر میں کہ اسرائیل کی آبادی صرف پچاس لاکھ ہے اور اسرائیلی ائر لائنز سے بمبئی تک کا کرایہ ایک ہزار امریکی ڈالر ہے یہ تعداد اچھی خاصی ہے۔

سیاحت کا فروغ ہند و اسرائیل کے تیزی سے بڑھتے تعلقات کے صرف ایک پہلو کو واضح کرتا ہے 1992 تک ہندوستان کے اسرائیل سے سفارتی تعلقات نہیں تھے۔ لیکن صرف 32 مہینوں کے بعد یہ تعلقات، اسرائیلی وزارت خارجہ کے مطابق بہت گہرے اور قریبی ہوگئے ہیں۔

اس دوران دونوں ملکوں کے درمیان تجارت کو فروغ ملا ہے۔ رواں سال کے لئے دو طرفہ تجارت کا تخمینہ چار سو ملین امریکی ڈالر لگایا گیا ہے۔ اور اسرائیلی حکومت کے اندازوں کے مطابق یہ تعداد 1999 تک بڑھ کر ایک بلین ڈالر ہو جائے گی۔ ہندوستان کے زیورات سے اسرائیل کی دوکانیں بھری پڑی ہیں۔ پورے اسرائیل میں ہندوستانی ہوٹل کھل گئے ہیں اور کیبل ٹی وی پر ہندوستانی پروگرام بھی نشر ہوتے ہیں۔ ہندوستان یہ امید بھی کر رہا ہے کہ بہت جلد وہ اسرائیلی سڑکوں کو ماروتی کاروں سے بھر دے گا۔

سیاحت اور تجارت کے علاوہ سیاسی سطح پر بھی کافی سرگرمیاں ہیں۔ دونوں ممالک کے اہم افسروں اور وزیروں نے دو طرفہ دورے کئے ہیں۔ پہلے دو سالوں میں ہندوستان سے اسرائیل کا دورہ کرنے والے اہم ناموں کی فہرست میں سابق خارجہ سکریٹری جے۔ این۔ دکشت، ارجن سنگھ، زراعت، تجارت اور سیاحت کے وزراء اور مہاراشٹر، گجرات اور ہریانہ کے وزراء اعلیٰ شامل ہیں۔ گذشتہ سال مئی میں اسرائیلی وزیر خارجہ شمعون پیریز نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔

اسرائیل میں ہندوستانی سفارتخانے کے فرسٹ سکریٹری این۔ پرساد کہتے ہیں "یہ بڑے اچھے تعلقات ہیں۔ ہم بڑے اچھے دوست ہیں۔ اور خود اسرائیل کی سوچ یہ ہے کہ ہندوستان ایشیا میں سب سے اہم ملک ہے "اے۔ پرساد کو یہ بھی یقین ہے

اسرائیل میں ہندوستانی سفارتخانہ کے فرسٹ سکریٹری این پرساد کے مطابق ہم بہت اچھے دوست ہیں اور خود اسرائیل کی سوچ یہ ہے کہ ہندوستان ایشیا میں سب سے اہم ملک ہے۔ ان کو یہ بھی یقین ہے کہ ان بہتر تعلقات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہیں ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ دونوں ممالک جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں۔

کہ ان بہتر تعلقات کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں وہیں ایک بڑا سبب یہ ہے کہ دونوں ہی ممالک جمہوریت میں یقین رکھتے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہندوستان کے جمہوری نظام کی وجہ سے اسرائیل چین کی بہ نسبت دہلی کی طرف زیادہ مائل ہے۔

اسرائیلی وزارت خارجہ میں شعبہ جنوب مشرقی ایشیا کے سربراہ ایوی شوکیٹ دونوں ملکوں کے مابین بڑھتے تعلقات کی ایک "دفاعی توجیہ" بھی کرتے ہیں شوکیٹ کے مندرجہ ذیل الفاظ قابل غور ہیں۔ "یہ حقیقت کہ ہندوستان اسلامی بنیاد پرستی جیسے مسائل سے دوچار ہے، اسے ان ممالک سے زیادہ قریب لارہی ہے۔ جو اس خطرناک رجحان کو روکنے میں مددگار ثابت ہوسکتے ہیں مثلاً اسرائیل"

اگرچہ دونوں ممالک کسی قسم کے دفاعی معاہدے یا تعاون سے انکار کرتے ہیں۔ لیکن پچھلے دنوں اسرائیلی وزارت دفاع کے ڈائرکٹر جنرل نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا۔ اسرائیل نے، جسے جمہوریت اور آزادی صحافت کا علمبردار تصور کیا جاتا ہے۔ اس دورے کی رپورٹنگ پر پابندی لگادی تھی۔ لیکن اس کے باوجود تل ابیب کے بعض اخباروں نے کھل کر لکھا کہ دونوں ممالک کے مابین ہتھیاروں کی تجارت سے متعلق بہت جلد ایک معاہدہ ہونے والا ہے۔ این۔ اے۔ پرساد کے مطابق "دفاع سے متعلق کچھ باتیں ضرور ہوئی ہیں لیکن ابھی کوئی حتمی فیصلہ نہیں لیا گیا ہے"۔

اگرچہ دونوں ممالک کسی بھی دفاعی معاہدے یا تعاون سے انکار کرتے ہیں لیکن پچھلے دنوں اسرائیلی وزارت دفاع کے ڈائرکٹر جنرل نے ہندوستان کا دورہ کیا تھا اور تل ابیب کے اخبارات نے لکھا تھا کہ دونوں میں بہت جلد ہتھیاروں کا معاہدہ ہونے والا ہے

ان بڑھتے ہوئے تعلقات کی توجیہ اسرائیل یوں کرتے ہیں کہ نرسمہا راؤ حکومت تل ابیب کے تئیں دوستی کے جذبات رکھتی ہے جب کہ سابقہ حکومت کا رویہ معاندانہ تھا۔ ایک دوسری وجہ وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ہندوستان کے تاجر اسرائیل سے متعلق اچھے جذبات رکھتے ہیں کیونکہ انہیں یہاں اپنی تجارت کو فروغ دینے کے بہتر مواقع میسر ہیں۔

لیکن غالباً سب سے بڑی وجہ پاکستان سے متعلق دونوں ممالک کے رویے اور پالیسیوں میں یکسانیت ہے۔ دونوں ہی پاکستان کو اپنے لئے بعض وجوہ سے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں۔ اس لئے دونوں کا ایک دوسرے سے قریب آنا بالکل فطری ہے۔ یعنی دشمن کا دشمن میرا دوست والی منطق یہاں کام کر رہی ہے۔ ••

کیا میخائل گورباچوف پھر روس کے صدر ہونگے؟

"اس کا فیصلہ عوام کریں گے، میں ابھی اپنے ارادے ظاہر نہیں کروں گا"

میخائل گورباچوف بے شک اب اقتدار میں نہیں ہیں لیکن ایسا بھی نہیں کہ انہیں تاریخ نے فراموش کر دیا ہو۔ سابق سوویت یونین کے صدر اپنا زیادہ تر وقت تدریس، روسی سیاست پر گفتگو اور بین الاقوامی صلیب الاحمر کی جانب سے پوری دنیا کے سفر میں گزارتے ہیں۔ صلیب احمر ایک ماحولیاتی تنظیم ہے جس کے وہ سربراہ ہیں۔ حال ہی میں انوائرمنٹل میڈیا ایسوسی ایشن سے خطاب کرنے لاس اینجلیز پہنچے تو ان سے نیوز ویک کے نمائندے آری پوزنر نے ملاقات کرکے حسب ذیل گفتگو کی۔

جواب: ماحولیاتی تحریک میں آپ کی شرکت کا کیا سبب ہے؟

جواب: 1988 میں اقوام متحدہ کے ایک اجلاس میں میں نے ماحولیات پر ایک غیر سرکاری تنظیم کی تشکیل کی ضرورت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ گلوبل فورم کو یاد آیا کہ میخائل گورباچوف کے پاس اس وقت کوئی سرکاری عہدہ نہیں ہے۔ یہ سوچ کر انہوں نے میری طرف سے عالم گیر ماحولیاتی تحریک کے سلسلے میں اٹھائی گئی آواز کی طرف مجھے توجہ دلائی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس ذمہ داری سے پہلو تہی کرنا مجھے اخلاقاً زیب نہیں دیتا۔

سوال: کہیں ایسا تو نہیں کہ چرنوبل جیسی تباہیوں نے آپ کو ماحولیاتی مسائل کے تئیں بیدار کردیا ہو۔

جواب: ہماری تاریخ پر نظر ڈالتے ہوئے آپ نے ضرور محسوس کیا ہوگا کہ شدید مصائب کے دور میں ایسے حالات پر گہرائی سے غور و خوض کرنا چاہئے جو زیادہ ذہن کو جھنجھوڑنے والی ہوں۔ اسی طرح روس، میں یعنی سابق سوویت یونین میں ہمارے ماحولیاتی مسئلہ نے ہمیں اس کے تئیں زیادہ بیدار کیا ہے۔

سوال: آپ مغرب میں بہت سے لوگوں کی نظر میں ایک ہیرو کا مقام رکھتے ہیں تاہم ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خود اپنے وطن روس میں آپ اتنے مقبول نہیں ہیں۔

جواب: ابھی کچھ دن پہلے تک میں اپنی مضافاتی رہائش گاہ میں اپنی خود نوشت سوانح عمری پر کام کر رہا تھا کہ کسی کا ٹیلوفون آیا۔ دوسری جانب بولنے والا شخص کوئی اور نہیں بلکہ ایک معروف روسی ادیب تھے جن سے میری اچھی شناسائی تھی انہوں نے کہا کہ ہم نے یہاں بہت سے روسی ادیبوں کو اکھٹا کیا ہے ان میں میخائیل سرگیوی وچ بھی ہیں۔

میں ذاتی طور پر ایک نئے اتحاد کو وجود پذیر دیکھنا چاہوں گا۔ جو یوکرین قزاخستان اور بیلاروس پر مشتمل ہوگا۔ یوکرین کی خود مختار ملک کی حیثیت برقرار رہے گی اور بیلاروس و قزاقستان کی اتحادی حیثیت بھی بحال رہے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو نئی جمہوریتیں بھی ٹوٹ کر الگ ہو سکتی ہیں۔

کہنا یہ ہے کہ آپ کو اقتدار سے ہٹا کر ہم کچھ خوش نہیں ہیں۔ آپ کئی اعتبار سے صحیح تھے اسی لئے اب ہمیں پچھتاوا ہو رہا ہے۔ اسی دوران کسی اور صاحب نے ریسور تھام لیا اور کہا کہ میں نے ایک بہت بیہودہ مضمون آپ کے بارے میں لکھا تھا اور اب میں آپ سے معافی کا خواستگار ہوں۔ یہ لوگ معروف اور سنجیدہ ادیب تھے جن کے منہ سے میں ایسی باتیں سن رہا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ روسی حکومت اس وقت جو کچھ کر رہی ہے اور جو اصلاحات لارہی ہے اسے دیکھ کر وہاں کے عوام اس نتیجے پر پہونچ رہے ہیں کہ روس میں جو واقعات رونما ہو رہے ہیں وہ ان کی امیدوں کے عین برعکس ہیں۔ وہ اس سے متفق ہیں کہ ملک کو تباہ کرنے کے بجائے انہیں اس کی تشکیل نو کرنی چاہئے تھی۔ کئی لوگوں نے مجھ سے سوال کیا کہ "آپ کو ہم بہت کم بولتے ہوئے دیکھتے ہیں حالانکہ ہمیں آپ کا نقطہ نظر جاننے کی خواہش رہتی ہے۔"

اصل بات یہ ہے کہ ٹیلی ویژن حکومت کی ملکیت میں ہے اور گذشتہ دو سالوں میں گورباچیف کے لئے ٹیلی ویژن پر آکر لب کشائی ممکن نہ تھی۔

اس کی وجہ گورباچوف اور روسی عوام کے درمیان کوئی مسئلہ نہیں تھا بلکہ مسئلہ تھا گورباچوف اور

باقی صــ!! پر

فلسطین کی مکمل آزادی اور خود مختاری ہی مغربی ایشیا میں پائیدار امن کا ضامن

حماس کے جانبازوں کے سرفروشانہ حملوں نے اسرائیل اور پی ایل او دونوں کے لئے مسائل پیدا کر دیئے ہیں۔ دراصل ان مسائل کا ابھر کر سامنے آنا بالکل فطری امر ہے۔ کیونکہ اوسلو معاہدہ کے پیٹ سے جنم لینے والا محدود خود مختاری کا معاہدہ ناانصافی پر مبنی ہے۔ یہ دو ایسی پارٹیوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا جو اپنے موجودہ حالات سے پریشان تھیں۔ 1987 سے چل رہی تحریک انتفاضہ نے اسرائیل کو سفارتی، معاشی اور سیاسی سطح پر کافی نقصان پہونچائے تھے۔ مختصر یہ کہ غاصبانہ قبضہ کو برقرار رکھنا فائدہ مند نہیں رہا تھا۔ چنانچہ اسرائیل نے ایک ایسے انداز میں اس علاقے کو خالی کرنے کا پروگرام بنایا جس سے اسے کم سے کم نقصان اور فلسطینیوں کو کم سے کم فائدہ پہونچے۔ اس حکمت عملی کے تحت اسرائیل نے یاسر عرفات سے مذاکرات کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ جنگ خلیج میں عراق کا ساتھ دینے کی وجہ سے وہ عرب دنیا میں یک وتنہا ہو کر رہ گئے تھے اور ایسا لگنے لگا تھا کہ ان کا سیاسی کیریر اختتام کو آن پہونچا ہے۔ اکثر عرب خصوصا تیل کی دولت سے مالا مال ممالک کی حمایت سے محروم یاسر عرفات اچانک اسرائیل کو بھلے لگنے لگے کیونکہ وہ ان سے زیادہ سے زیادہ مراعات حاصل کر سکتا تھا۔ اپنے سیاسی کیریر کو بچانے کے لئے یاسر عرفات کے پاس بھی اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ چنانچہ دونوں پارٹیاں اپنی مخصوص قسم کی مجبوریوں کے پیش نظر مذاکرات پر آمادہ ہو گئیں۔ مگر آخر کار جس امن معاہدہ پر دستخط ہوئے وہ بنیادی طور پر اسرائیل کے حق میں تھا اور اس سے یاسر عرفات کو جو کچھ ملا وہ خطرات سے پر ہونے کے علاوہ آئے دن نئے نئے مسائل جنم دینے کی صلاحیت بھی رکھتا تھا۔

اسرائیل۔ پی ایل او امن معاہدے میں یوں تو بہت ساری خامیاں ہیں مگر سب سے بڑا مسئلہ مقبوضہ علاقوں میں آباد کی گئی یہودی آبادیاں ہیں، یہ آبادیاں بساتے وقت اسرائیل نے عہد کیا تھا کہ وہ مقبوضہ علاقوں سے نہ صرف دستبردار نہیں ہوگا بلکہ صدیوں سے آباد عربوں کو وہاں سے نکال باہر کرے گا۔ ظاہر ہے یہ آبادیاں ایک مستقل مسئلہ ہیں۔ خود اسرائیل کے حامی مغربی ممالک کہتے ہیں کہ کم از کم کچھ آبادیاں تو فورا ختم کر دی جانی چاہئیں مگر اسحاق رابن اس کے خلاف ہیں اور ظاہر ہے اس کا صاف مطلب ہے کہ اسرائیلی فوج کم از کم ان علاقوں میں ضرور رہے گی جہاں یہودی آبادیاں موجود ہیں۔

امن معاہدے کے مطابق اگلا اسٹیج مغربی کنارے سے اسرائیلی فوجیوں کی واپسی اور وہاں پر پی ایل او کی عملداری کا ہے جس سے متعلق مذاکرات چل رہے ہیں۔ جب یہ مرحلہ پورا ہو جائے گا تو عام انتخابات کے ذریعہ ایک فلسطینی اختیاراتی باڈی کا قیام عمل میں آئے گا جو پورے علاقے پر "حکومت" کرے گی۔ مگر اس باڈی کے بارے میں پی ایل او اور اسرائیل کے درمیان اختلافات ہیں۔ اسرائیل چاہتا ہے کہ یہ صرف ایک انتظامی باڈی ہو جب کہ پی ایل او کی خواہش ہے کہ اسے قانون بنانے کے بھی اختیارات حاصل ہونے چاہئیں۔ یہ کوئی معمولی اختلافات نہیں ہے، اس کی تہ میں بہت کچھ ہے، اسرائیل کا منشاء یہ ہے کہ فلسطین کبھی ایک آزاد ریاست نہ بن سکے جب کہ پی ایل او کی کوشش یہ ہے کہ فلسطین جلد از جلد ایک خود مختار ریاست بن جائے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ انتخابات کے ذریعہ ایک ایسی باڈی کا قیام چاہتی ہے جو نہ صرا انتظامی ہو بلکہ اسے قوانین بنانے کا بھی اختیار ہو۔

اس سے قطع نظر کہ مذکورہ باڈی محض انتظامی ہوتی ہے یا اسی کے ساتھ قانون ساز ادارہ بھی، یہودی آبادیوں کا مسئلہ اپنی جگہ باقی رہتا ہے۔ جب تک یہ آبادیاں فلسطینی علاقوں میں ہیں، اس وقت تک اسرائیلی فوج وہاں موجود رہے گی اور وہاں بسائے گئے یہودیوں کی حفاظت کے لئے نت نئے ایسے قوانین بھی بنائے گی جس سے عام فلسطینیوں کو بہت سے مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس مسئلے کی اہمیت کو الخلیل (Hebron) کی مثال سے سمجھا جاسکتا ہے۔ یہاں نہ صرف یہ کہ تقریبا چار ہزار یہودی شہر سے باہر آباد کئے گئے ہیں بلکہ چار سو سے زیادہ تو عین شہر کے قلب میں بسائے گئے ہیں گذشتہ فروری میں جب ایک یہودی دہشت گرد نے مسجد

(باقی صفحہ ۱۲ پر)

> لولے لنگڑے امن معاہدے کو پی ایل او اور اسرائیل نے اپنی اپنی مجبوریوں کے تحت نبھایا ہے۔ چاہے مذکورہ بالا مسئلے کو بھی وہ اپنی اپنی مجبوریوں کے تحت حل کر لیں۔ مگر ایسی موقع پرستانہ پالیسیوں اور فلسطین کی مکمل آزادی و خود مختاری کے بغیر حقیقی اور پائدار امن بہر حال قائم نہیں ہو پائے گا۔

یروشلم کو مکمل یہودی شہر بنانے کی سازش

یروشلم کی مذہبی اور سیاسی حیثیت نے اس حقیقت کو واضح کیا ہے کہ کس طرح سے فلسطینیوں کو منصوبہ بندی کے تحت بے دخل کیا گیا اور یہودیوں کو بسایا گیا ہے۔ یہاں یہودی اکثریت کے قیام کے مقصد کے پیش نظر فلسطینیوں کی زمینوں پر غاصبانہ قبضہ کیا گیا انکے مکانات کو منہدم کیا گیا اور لائسنس نہ دینے کی پالیسی پر عمل کیا گیا تاکہ فلسطینی وہاں سے بھاگنے پر مجبور ہو جائیں۔ اس پالیسی پر عمل آوری کے نتیجے میں آج مشرقی یروشلم میں فلسطینیوں کی آبادی گھٹ کر ایک لاکھ 55 ہزار ہو گئی ہے جبکہ یہودیوں کی آبادی ایک لاکھ 60 ہزار تک پہنچ گئی ہے۔ فلسطینیوں کو کس طرح یروشلم سے منظم طریقے سے بے دخل کیا گیا اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 1967ء کے بعد سے یروشلم میں آباد پچاس ہزار فلسطینیوں کو یا تو میونسپل سرحدوں سے باہر یا ملک سے باہر کھدیڑ دیا گیا ہے۔

خود یروشلم میونسپلٹی کے ایک مطالعے کے بموجب آج 21 ہزار فلسطینیوں کے پاس یا تو گھر نہیں ہیں یا دوسروں کے ساتھ ایک ایک مکان میں ضرورت سے زیادہ تعداد میں رہائش اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ان افراد نے ہاؤسنگ زون میں اپنے مکانات تعمیر کئے تھے لیکن حکومت نے آئین و قانون کا غلط طریقے سے سہارا لیکر انہیں 68 فیصد زمین سے بے دخل کر دیا۔ جس کے نتیجے میں بے شمار خاندان کیمپوں، بسوں اور غاروں میں پینے کے پانی، بجلی اور سیور کی سہولیات کی عدم موجودگی میں زندگی گزار رہے ہیں یا پھر دوسروں کے گھروں میں غیر صحت مند ماحول میں بھیڑ بھاڑ کی شکل میں جینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی پالیسی یہودی باز آباد کاروں کے حق میں ہے۔ جس کی بناء پر انہوں نے فلسطینیوں کی غصب شدہ زمینوں پر ان کی رہائش گاہوں سے چند میٹر کے فاصلے پر اپنے مکانات تعمیر کر لئے ہیں ان یہودی باز آباد کاروں کو آٹھ منزلہ مکانات کی تعمیر کی اجازت ہے جبکہ فلسطینیوں کو دو منزل سے اوپر مکان بنانے کی ہرگز اجازت نہیں ہے۔ علاوہ بریں یروشلم کی فلسطینی میونسپل خدمات کی کل لاگت کا 26 فیصد ٹیکس کی شکل میں ادا کرتے ہیں۔ جبکہ انہیں اس کے بدلے میں پانچ فیصد میونسپل خدمات بھی میسر نہیں ہو پاتیں۔ جس کے نتیجے میں فلسطینیوں کی چالیس فیصد آبادی میں سیور کی سہولت بھی نہیں ہے۔

اسرائیلی حکومت کی متعصبانہ پالیسیوں کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ 70 ہزار یہودی باز آباد کاروں کو مکانات کی تعمیر میں امداد دی گئی ہے جبکہ فلسطینیوں کے محض 555 خاندانوں کو سہولت دی گئی ہے۔ ہاؤسنگ زون میں زمینوں کی قلت کے سبب مکان تعمیر کرنے کے لئے اجازت نامہ حاصل کرنا تقریبا ناممکن ہے یہی وجہ ہے کہ اگر بغیر اجازت کے کوئی مکان تعمیر کرتا ہے تو اسکا مطلب ہے اسکا انہدام۔ خواہ مکان کے ایک ہی حصے کو کیوں نہ منہدم کر دیا جائے۔ تازہ ترین اعداد و رشمار کے مطابق وسط 1987ء سے اب تک مشرقی یروشلم میں فلسطینیوں کے 222 مکانوں رکو منہدم کیا جا چکا ہے۔ یہ سلسلہ بدستور جاری ہے اور مکانوں کے رانہدام کی شرح پچاس مکان سالانہ ہے

انتظامیہ دیہی علاقوں میں بھی مکانوں کو منہدم کرتی ہے تاکہ بغیر اجازت کے مکانات کی تعمیر کا سلسلہ روکا جاسکے۔ جس کے نتیجے میں وادی قدوم میں واقع عدنان ابو نجم کے مکان کو بھی منہدم کر دیا گیا ہے اور وہ، ان کی بیوی اور بچے گذشتہ دس مہینوں سے اپنے منہدم شدہ مکان کے سامنے ایک بحری جہاز کے ڈبے میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وادی قدوم میں تقریبا دس مکانات اور ہیں جن پر انہدام کی تلوار لٹک رہی ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں 1967 میں پرانے شہر کے مغربی کوارٹر میں مکانات کے انہدام کے بعد وہاں کے سیکڑوں فلسطینیوں نے آکر رہائش اختیار کر لی ہے۔ واضح ہو کہ فلسطینیوں کو وہاں سے اس لئے بھاگنے پر مجبور کر دیا گیا تھا تاکہ دیوار گریہ کے سامنے یہودی کوارٹروں اور ایک رہائشی پلازہ کی تعمیر ہو سکے نیز یہودی باز آباد کاروں کی بستی کو وسیع کیا جاسکے۔ اس واقعے کے 27 سال بعد یہ لوگ ایک بار پھر بے دخلی کے عذاب میں مبتلا اور بین الاقوامی توجہ کے محتاج ہیں۔

آج صورتحال یہ ہے کہ یروشلم کے شمال، جنوب اور مشرق میں یہودی باز آباد کاروں کی بستی کو غیر قانونی طریقے سے وسعت دی جارہی ہے اور حکومت کی مکمل حمایت اسے حاصل ہے۔ ساتھ ہی اسکا بھی اندیشہ ہے کہ یروشلم کی میونسپل سرحدوں کو بھی وسعت دی جائے گی تاکہ "عظیم یروشلم" کی تشکیل ہو سکے اور شہر میں 78 اور 22 کی شرح سے یہودی اور عرب آبادی تشکیل پا سکے۔ "باز آباد کاری کے انجماد" کے فیصلے کے باوجود یروشلم میونسپلٹی کی سالانہ رپورٹ کے مطابق یہودیوں کے لئے 31413 نئے مکانوں کی تعمیر کا منصوبہ بنایا گیا ہے اور اس کے ساتھ چار ہزار اضافی عمارت بھی معرض وجود میں آئیں گی۔ جبکہ دوسری طرف فلسطینیوں کے رہائشی مکانوں کا مسئلہ حل کرنے کی جانب اسرائیلی حکومت کی طرف سے کوئی قدم نہیں اٹھایا جارہا ہے۔

●●●

> فلسطینیوں کو کس طرح یروشلم سے منظم انداز میں بے دخل کیا گیا ہے اسکا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ صرف 67ء کے بعد سے یروشلم میں آباد پچاس ہزار فلسطینیوں کو یا تو میونسپل سرحدوں سے باہر یا ملک سے باہر کھدیڑ دیا گیا ہے، جس کے نتیجے میں آج فلسطینیوں کی آبادی ایک لاکھ 55 ہزار رہ گئی ہے اور یہودیوں کی ایک لاکھ 60 ہزار ہو گئی ہے۔

> بے شمار فلسطینی خاندان کیمپوں، بسوں اور غاروں میں پینے کے پانی، بجلی اور سیور کی سہولیات کی عدم موجودگی میں زندگی گزار رہے ہیں یا پھر دوسروں کے گھروں میں غیر صحتمند ماحول میں بھیڑ بھاڑ کی شکل میں جینے پر مجبور ہیں۔ حکومت کی پالیسی بھی یہودیوں کی حمایت کرتی ہے۔ انہیں آٹھ آٹھ منزلہ مکان بنانے کی اجازت ہے جبکہ فلسطینیوں کو دو منزل سے اوپر نہیں لے جانے دیا جاتا۔

کیا مغرب کا نیا عالمی نظام مسیح دجال کا نظام ہے؟

بدلتا ہوا عالمی منظر نامہ اور غلبہ اسلام کی جدوجہد دجال کی آمد کا پیش خیمہ تو نہیں؟

پوری دنیا خصوصاً مغرب میں غلبہ اسلام کے لئے جو جدوجہد چل رہی ہے اس کے پیش نظر یہ بات کہی جارہی ہے کہ قیامت سے قبل پوری دنیا پر اسلامی پرچم کے لہرانے کا زمانہ شاید قریب آگیا ہے۔ کچھ معلمین قرآن بھی قرآن کریم کی آیات کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد اسی قسم کی بات کہہ رہے ہیں۔ بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے اور مشرق وسطی میں اسرائیل کے بتدریج معزز ہونے اور عالم اسلام کی جانب سے اسے شرف قبولیت بخشنے کے تناظر میں اس پیش گوئی کے سچ ثابت ہونے کا بھی زمانہ شاید قریب آگیا ہے کہ قیامت سے قبل مسیح دجال کا ظہور ہوگا۔ موجودہ عالمی حالات اور مغربی ممالک وعالم اسلام میں رونما ہونے والے واقعات کے پیش نظر یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ واقعات مسیح دجال کی آمد کا پیش خیمہ تو نہیں ہیں؟ پاکستان کے ایک معروف معلم قرآن ڈاکٹر اسرار احمد کے تجزیوں کا مطالعہ کیا جائے تو اس پر یقین کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں رہ جاتا کہ مطلع عالم پر آفتاب اسلام کے چمکنے اور پوری دنیا کی فضاؤں میں پرچم اسلام کے لہرانے کا زمانہ شاید قریب آگیا ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد نے بعض عالمی واقعات کو احادیث کی روشنی میں کچھ اس انداز سے دیکھا ہے کہ عام آدمی کی نگاہ وہاں تک نہیں پہنچ سکتی۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا کہنا ہے کہ مغرب کا نیا عالمی نظام ہی مسیح دجال کا نظام ہے جس کے کلی قیام کے بعد حضرت مسیح کا ظہور لازم ہو جائے گا۔ قرآن کی ایک آیت کا حوالہ دیتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ یہودی اور عیسائی آپس میں ایک دوسرے کے دوست اور حمایتی ہیں (المائدہ 51-52) وہ کہتے ہیں کہ دراصل ایک پیش گوئی تھی جو آج کے زمانے میں پوری ہوئی ہے، ورنہ (بعضہم اولیاء بعض) کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہوسکتا۔ اس سے قبل عیسائیت کی پوری دو ہزار سالہ تاریخ کے دوران یہودیوں اور عیسائیوں میں مسلسل دشمنی رہی ہے چنانچہ پہلے تین سو سال تک یہودی اور رومی دونوں نے ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے ہیں اور جب چوتھی صدی عیسوی میں رومی سلطنت نے عیسائیت قبول کر لی تو اس کے بعد سے مسلسل یہودیوں پر عرصہ حیات تنگ کرتے رہے یہاں تک کہ خود بیسویں صدی کے وسط میں نازی جرمنی کے عیسائیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو نیست و نابود کیا جس کی مثال پوری انسانی تاریخ میں نہیں ملتی۔ خود جس وقت قرآن کی یہ آیت نازل ہو رہی تھی اس وقت اور اس کے بعد بھی فی الواقع عیسائیوں اور یہودیوں کے درمیان دوستی موجود نہیں تھی لہذا (بعضہم اولیاء بعض) کا کوئی دوسرا مطلب نہیں ہوسکتا۔ یہ ایک پیش گوئی تھی جو آج کے زمانے میں پوری ہوئی اور اس کا تکمیلی مرحلہ حال ہی میں ڈرامائی انداز میں سامنے آیا ہے جب پوپ کے ایک فرمان کے ذریعہ ساڑھے انیس سو سالہ تاریخ بدل دی گئی اور وہ یہودی قوم جو خدا کے صلبی بیٹے کو سولی دینے کی مجرم قرار دی جاتی تھی بیک جنبش قلم بری قرار دی گئی پھر چند ہی ہفتے قبل خبر آئی کہ ویٹی کن (Vatican) نے اسرائیل کو تسلیم کر لیا ہے اور اس کا سفارت خانہ بہت جلد یروشلم میں قائم ہو جائے گا اور یہ تو کچھ ہی دنوں قبل کی بات ہے کہ اسرائیل کے وزیر اعظم اسحاق رابن نے واشنگٹن سے واپسی پر روم میں پاپائے اعظم سے ملاقات کی اور انہیں اسرائیل کا دورہ کرنے کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ کوئی چیز یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ اس کی حفاظت تین ہزار برس تک تو ہم نے کی ہے، اب یہ آپ کے حوالے ہے اور آئندہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری آپ پر ہے۔

یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دجال کے عالمی نظام کی تکمیل میں اب تک جو خطہ سب سے زیادہ مزاحم ثابت ہو رہا تھا وہ مسلمانوں پر مشتمل مشرق وسطی کا وہ علاقہ تھا جسے اب عرب و اسرائیل امن مشن کے نام پر فتح کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بات محض اتفاق نہیں ہوسکتی کہ اس سلسلے کی امن کانفرنس تہذیب حجازی کے مزار اسپین کے دار الخلافہ میڈرڈ میں منعقد ہوئی۔ دجال کے اس عالمی نظام کی قیادت بظاہر اس وقت امریکہ کر رہا ہے جسے دراصل اس وقت یہودیوں کی سیاسی قوت کے اعلامیے کی حیثیت حاصل ہے۔ نئے دجالی نظام میں ایک اہم رول اقوام متحدہ بھی ادا کر رہا ہے جو دراصل اسرائیلی مفادات کا ہی محافظ ہے اور جس پر اسرائیل کی گرفت سخت ہے۔ واضح رہے کہ اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بطروس غالی کو اپنی نامزدگی سے قبل اور امریکی صدر سے بھی اپنی ملاقات سے قبل اسرائیلی وزیر اعظم کی رضامندی حاصل کرنی پڑی تھی۔ پھر امریکہ کا پورا وجود ہی اسرائیل کی حفاظت و سرپرستی کے لئے قائم ہے جس کا اظہار خلیج کی جنگ کے موقع پر اتحادی افواج کے کمانڈر جنرل شورز ذکراف نے کیا تھا، جنگ کے فوراً بعد اس نے کہا تھا کہ ہم نے یہ جنگ صرف اسرائیل کے تحفظ کے لئے لڑی ہے اور اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ امریکہ کے سابق صدر کی کتاب "سیز دی مومنٹ" خلیج کی جنگ کے بعد شائع ہوئی اس میں بھی انہوں نے لکھ دیا کہ اسرائیل کی حفاظت ہماری خارجہ پالیسی کا اہم ترین جز ہونا چاہئے۔

> یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ دجال کے عالمی نظام کی تکمیل میں اب تک جو خطہ سب سے زیادہ مزاحم ثابت ہو رہا تھا وہ مسلمانوں پر مشتمل مشرق وسطی کا وہ علاقہ تھا جسے اب عرب و اسرائیل امن مشن کے نام پر فتح کر لیا گیا ہے۔ اور یہ بات محض اتفاق نہیں ہو سکتی کہ اس سلسلے کی امن کانفرنس تہذیب حجازی کے مزار اسپین کے دار الخلافہ میڈرڈ میں منعقد ہوئی۔

امریکہ کی قیادت میں نئے عالمی نظام کا نعرہ دراصل فتنہ دجالیت کا نقطہ عروج اور المسیح الدجال کے ظہور کی تمہید ہے جس میں دراصل اصل عامل کی حیثیت تو یہودیت کو حاصل ہے البتہ پورا عالم عیسائیت بھی یہودیت کا شریک اور آلہ کار ہے۔ گو یا امریکہ ہو یا برطانیہ، فرانس اور اقوام متحدہ ہو یا "جی سیون" سب صہیونیت کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں۔

> امریکہ کی قیادت میں نئے عالمی نظام کا نعرہ دراصل فتنہ دجالیت کا نقطہ عروج اور مسیح دجال کے ظہور کی تعبیر ہے۔ جس میں اصل عامل کی حیثیت تو یہودیت کو حاصل ہے البتہ پورا عالم عیسائیت یہودیت کا شریک کار اور آلہ کار ہے۔ گویا امریکہ، برطانیہ اور فرانس سبھی "جی سیون" کی زلف گرہ گیر کے اسیر ہیں

پھر قرآن کے ارشادات اور احادیث نبوی میں المسیح الدجال کے متعلق تفاسیر کی روشنی میں نئے صہیونی عالمی نظام کو بھی سمجھنے کی کوشش کی جانی چاہئے یہودی خود کو خدا کی پسندیدہ قوم سمجھتے ہیں اور دوسرے تمام انسانوں کو انسان نما حیوان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور ان کے معاشی استحصال کو اپنا قانونی اور اخلاقی حق سمجھتے ہیں چنانچہ صدیوں کی مساعی کے نتیجے میں انہوں نے سود پر مبنی نظام بنک کاری اور سونے چاندی کے سکوں کے بجائے پیپر کرنسی کو رواج دیا۔ دوسری جانب کاروباری اور صنعتی حصص کی کاغذی دستاویزات اور اسٹاک ایکسچینج پر مشتمل ایک ایسا عالمی مالیاتی نظام قائم کیا ہے جو اب پوری دنیا کو اپنی گرفت میں لے چکا ہے اور ان کے لئے ممکن ہے کہ جب چاہیں جہاں چاہیں مالیاتی نظام میں زلزلہ پیدا کر دیں۔ چنانچہ آج یہودیوں کے زیر کنٹرول ادارے، ورلڈ بینک اور آئی ایم ایف نہ صرف پوری دنیا کو کنٹرول کر رہے ہیں بلکہ اس طرح اپنی دجالی تہذیب کو بھی پوری قوت کے ساتھ دنیا میں جاری کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں۔ یہاں یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ امریکہ کے ایک ڈالر کے نوٹ پر واقعتاً اہرام مصر ہی کی تصویر طبع ہوتی ہے اور اس کے نیچے "نووس اور ڈوسیکلورم" کے الفاظ لکھے ہوتے ہیں جو گویا نیو ورلڈ کے نظام کے قیام کی عکاسی کرتے ہیں اور سب سے بڑھ کر معنی خیز بات یہ ہے کہ اہرام کی تصویر کے بالائی حصے میں ایک آنکھ بنی ہوئی ہے جو دراصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کی تفسیر ہے کہ دجال یک چشم ہوگا۔

ایک دوسری دلچسپ بات بائبل کی آخری کتاب مکاشفات یوحنا کے سترہویں باب میں درج ہے اس باب میں ایک ایسے عظیم اور خونخوار درندے کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے سات سر ہیں اور دس سینگ اور اس پر ایک عورت سوار ہے۔ یہ درندہ خود بھی مجسم کفر اور الحاد ہے اور اس پر سوار عورت بھی سراپا بدکاری کا نمونہ ہے۔ مکاشفہ کے مطابق اس درندے کا مقابلہ ایک میمنہ سے ہوگا جو اسے ہلاک کر دے گا۔ حکمت ایمانی سے ادنی ترین مناسبت رکھنے والا شخص بھی فوراً پہچان لے گا کہ یہ اصل فتنہ دجال کی تعبیر ہے چنانچہ درندے سے مراد عہد حاضر کے خوفناک ہتھیاروں سے لیس مغربی ممالک ہیں جن کے جسد واحد ہونے کا ثبوت خلیج کی جنگ میں واضح ہو کر سامنے آچکا ہے اور کیا عجب کہ سات سروں سے مراد آج کے جی سیون ہوں اور ان کے سروں پر سوار وہ بدکار عورت سلطنت اسرائیل ہے جس کی حفاظت کے لئے یہ تباہ کن جنگ لڑی گئی تھی۔ اور یہ وہ میمنہ جو اس عفریت کو ہلاک کرے گا وہ دراصل حضرت عیسیٰ جیسے بے ضرر اور رقیق القلب انسان کی تعبیر ہے جن کی آمد کے عیسائی اور مسلمان دونوں منتظر ہیں اور جن کے ظہور کا شاید وقت قریب آچکا ہے۔ ـــ

> مکاشفات یوحنا میں ایک درندے کی تصویر کشی کی گئی ہے جس کے سات سر اور دس سینگ ہیں اور اس پر ایک عورت سوار ہے۔ اس درندے کا مقابلہ ایک میمنہ سے ہوگا جو اسے ہلاک کر دے گا۔ اس کی تعبیر یہ ہے کہ درندے سے مراد عہد حاضر کے خوفناک اسلحوں سے لیس مغربی ممالک ہیں جن کے جسد واحد ہونے کا ثبوت جنگ خلیج میں مل گیا ہے۔ کیا عجب کہ سات سروں سے مراد آج کے "جی سیون" ہوں اور اس درندے پر سوار عورت سلطنت اسرائیل ہو۔

بقیہ: اسلامی اسکارف

ایجنٹ کے لئے الجزائر کی زمین تنگ ہو جائے گی اور انہیں چار و ناچار فرانس کی جانب ہجرت کرنا ہوگا۔ جس سے فرانس میں مہاجرین کی تعداد حد درجہ بڑھ جائے گی جس کا بوجھ فرانس کی معیشت برداشت نہ کر سکے گی۔ یہی سبب ہے کہ فرانسیسی حکومت نہ صرف الجزائر کی غیر آئینی غیر جمہوری فوجی حکومت کو اپنی حمایت جاری رکھنے کی پالیسی پر کاربند ہے۔ بلکہ خود فرانس میں مقیم عام مسلمانوں اور بالخصوص الجزائر کے ان سرفروشان اسلام کو اپنی جارحیت کا نشانہ بنائے ہوئے ہے جو الجزائر کے اسلامک فرنٹ کے حامی ہیں یا ان سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

بہرکیف فرانسیسی حکومت کی اسلام دشمنی کا رویہ سرفروشان اسلام کے عزائم کو کمزور کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ فرانسیسی حکومت کی تادیبی اور جارحانہ کارروائیوں اور مسلم خواتین اور طالبات کے لئے اسکارف کے استعمال پر پابندیوں کے حکم کے خلاف فرانس میں پرزور احتجاج کا سلسلہ جاری ہے۔ جسے بعض جمہوری اداروں اور انسانی حقوق کے علمبردار حلقوں سے بھی حمایت مل رہی ہے۔

مغرب کی خدا بیزار تہذیب پر

اسلامی اسکارف کا حملہ

گذشتہ دنوں فرانس کی حکومت کی جانب سے فرانس میں مقیم مسلم طالبات کے ذریعے اسلامی اقدار و شرعی تقاضے کے مطابق سروں پر اسکارف یا چادر کے استعمال پر پابندی مغربی دنیا کی اس نفسیاتی شکست کا کھلا اعلامیہ ہے جو ان ممالک میں رائج اباحیت کے بالمقابل اسلامی اقدار کی پیروی اور اس کی مقبولیت سے پیدا ہو رہی ہے۔ جو لوگ مغربی ممالک کی صورت حال اور وہاں کی تہذیبی، مذہبی و اخلاقی حالت زار سے واقف ہیں ان سے یہ بات پوشیدہ نہیں کہ اپنی سائنسی ترقی کے تمام تر بلند و بانگ دعوے کے باوجود مغربی دنیا زبردست قسم کے اخلاقی بحران سے دو چار ہے۔ کیوں کہ سائنسی ترقی کا غلام مغربی معاشرہ بظاہر کتنا بھی روشن خیال اور چمک دمک میں ملبوس کیوں نہ نظر آتا ہو اس کے بطون میں اخلاقی و روحانی خلاء و اور تاریکی کا سایہ اسی شدت سے گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ایسے میں ان ممالک میں مقیم اسلام کے پیروکاروں کے اقدار و اطوار اور ان کا فکری و روحانی پیغام مہیب تاریکی میں روشن شمع کی طرح اپنے پروانوں کے لئے کشش کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ نتیجے میں آئے دن بڑی تعداد میں مغربی ممالک کے اخلاقی حالت زار سے بدظن خواتین و مرد اسلام کی جانب کھنچتے چلے جا رہے ہیں۔ اس وقت بالخصوص مغربی ممالک کی خواتین میں اسلامی اقدار کی جانب راغب ہونے کا رجحان کافی مقبولیت حاصل کرتا جا رہا ہے۔ اسلامی پردے کے خلاف فرانسیسی حکومت کا حالیہ تادیبی قدم مغرب کی اسی بوکھلاہٹ کا اشاریہ ہے۔

فرانس اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور ماڈرن معاشرہ تصور کیا جاتا ہے ظاہر ہے اس معاشرے میں اباحیت بھی اسی درجہ عروج پر ہے۔ اشتعال انگیز موسیقی و رقص ہو یا عریانیت کی انتہا کو پہنچا لباس اور فیشن فرانس کا معاشرہ مغربی دنیا کی نام نہاد "ماڈرنزم" کا معیار تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس معیار کو اس وقت اسلامی اقدار و معیار سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کیونکہ الجزائر نژاد اسلامی جیالوں نے فرانسیسی معاشرے کے سامنے جو چیلینجز پیدا کر دیے ہیں ان میں دیگر اسلامی اقدار و اخلاق کے ساتھ ساتھ بڑی تعداد میں مسلم خواتین کے ذریعے پردے اور مہذب و باعصمت لباس زیب تن کرنے کی زبردست مہم بھی شامل ہے۔ سڑکیں ہوں یا بازار ریلوے اسٹیشن ہوں یا ہوائی اڈہ اسکول ہوں یا کالج ہر جگہ مسلم خواتین اپنے اسلامی لباس اور شرعی لوازم کی پیروی کرتی نظر آتی ہیں۔ بالفاظ دیگر پردے کی بڑھتی مقبولیت فرانس کے اس "جدید تر معاشرے" میں اسلامی تشخص اور شناخت کی علامت بنتی جا رہی ہے۔ جو فرانس کی اباحیت زدہ حکومت اور جماعتوں کے لئے رفتہ رفتہ نفسیاتی شکست کی علامت بھی تصور کی جانے لگی ہے۔

گو مبصرین کا خیال ہے کہ فرانسیسی حکومت کے خوف کا اصل محرک وہ الجزائری نژاد فرانسیسی باشندے ہیں جو اپنے آبائی وطن الجیریا کے بنیاد پرست اسلامک سالویشن فرنٹ سے خصوصی ہمدردی رکھتے ہیں، اور مسلم خواتین کے درمیان بھی الجیریا کے اسلامک سالویشن فرنٹ کے لئے خاصی حمایت و ہمدردی کا جذبہ موجود ہے، سروں پر اسکارف اور پردے کا اہتمام کرنے والی خواتین کو غیر مشروط طور پر فرانسیسی حکومت اسلامک سالویشن فرنٹ کی حامی تصور کرتی ہے یہی سبب ہے کہ اس نے نوجوان طالبات اور خواتین کے لئے سرکاری اداروں اور بالخصوص تعلیمی اداروں میں مع اسکارف و پردہ کے استعمال کو اسلامی اقدار کا اشتہار تصور کرتی ہے۔ اس لئے اس پر پابندی کو قانونی اعتبار سے جائز قرار دیتی ہے۔ وزیر تعلیم فرانکوئس بائیرو نے تعلیمی اداروں میں اسکارف پر پابندی کی پرزور وکالت کرتے ہوئے اسلامی پردے اور خواتین کے ذریعہ اسکارف یا سر پر چادر پوشی کو "نمائشی" مذہبی علامت قرار دیا اور کہا کہ ایسی روایت پر پابندی لازمی ہے۔

لیکن مبصرین کا خیال ہے کہ فرانسیسی حکومت کا یہ اقدام سراسر اس کے اسلام مخالف رویے کا اظہار ہے کیونکہ فرانس میں دیگر مذاہب کے پیروں پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے لئے گلے میں کراس یا ڈیو اسٹار لٹکانے یا یہودیوں کے لئے صہیونی ٹوپی پہننے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ اس اعتبار سے فرانس کا یہ قدم اسلام کے خلاف امتیازی سلوک کے مترادف ہے۔ علاوہ بریں خود دیگر مغربی ممالک میں کسی مذہب کے پیروں کے خلاف ایسی کوئی پابندی کہیں نہیں ہے۔ خواہ جرمنی ہو یا انگلینڈ، اسپین ہو یا اٹلی یا پھر امریکہ کہیں بھی مذہبی تشخص اور شناخت کے اظہار پر کسی قسم کی کوئی قانونی پابندی نہیں ہے۔ اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ لوگ جمہوری اور جدید طرز فکر کے معاشرے میں اخلاق اطوار، تہذیب و ثقافت اور لباس و خوراک اختیار کرنے اور ان پر کاربند ہونے کے مجاز ہوں، ورنہ ایک ترقی یافتہ معاشرے کی مفاہمت و ہم آہنگی اور پر امن بقائے باہم کے اصولوں پر کاربند ہونے کا تمام بلند و بانگ دعوی محض ایک کھوکھلا نعرہ بن کر رہ جائے گا۔ فرانس کا اسلام مخالف حالیہ رویہ مغرب کی ترقی یافتہ اور جدید جمہوری معاشرے اور حکومت کا پول کھولنے کے لئے کافی ہے۔

> **فرانس کا معاشرہ مغربی دنیا کی نام نہاد "ماڈرنزم" کا معیار تصور کیا جاتا ہے۔ لیکن اس معیار کو اس وقت اسلامی اقدار و معیار سے زبردست خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔ کیوں کہ الجزائری نژاد اسلامی جیالوں نے فرانسیسی معاشرے کے سامنے جو چیلنج پیدا کر دئے ہیں اس سے فرانسیسی حکومت کے ہوش گم ہوتے نظر آرہے ہیں۔**

> **فرانسیسی حکومت کا یہ قدم سراسر اس کے اسلام مخالف رویے کا اظہار ہے۔ کیوں کہ فرانس میں دیگر مذاہب کے پیروں پر ایسی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ مثلاً عیسائیوں کے لئے گلے میں کراس یا ڈیوڈ اسٹار لٹکانے یا یہودیوں کے لئے صہیونی ٹوپی پہننے پر کسی قسم کی کوئی پابندی عائد نہیں ہے۔ تو پھر اسکارف پر ہی پابندی کیوں؟**

مبصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلامی انقلابیوں سے فرانسیسی حکومت کے خائف ہونے کی وجہ یہ بھی ہے کہ فرانس کی موجودہ حکومت الجزائر کی غیر آئینی فوجی حکومت کی حامی ہے۔ جس کے خلاف الجزائر کی اسلامک سالویشن فرنٹ برسرپیکار ہے۔ کیونکہ 1992 میں الجزائر میں ہونے والے جمہوری انتخابات میں اسلامک سالویشن فرنٹ اقتدار میں آرہی تھی لیکن فوجی جارحیت کے ذریعہ الجزائری حکومت نے اسلامک سالویشن فرنٹ کے جمہوری انتخابات کو ناکامی میں تبدیل کر کے اسلامک سالویشن فرنٹ کو ہتھیار بند بغاوت پر مجبور کر دیا نتیجے میں گذشتہ دو برسوں سے اسلامک سالویشن فرنٹ الجزائر میں جمہوری نظام کے قیام کے لئے ہتھیار بند احتجاج جاری رکھے ہوئے ہے۔ اس احتجاج اور فوجی جارحیت کے نتیجے میں ایک اندازے کے مطابق کم از کم چار ہزار سے دس ہزار کے درمیان جانیں تلف ہو چکی ہیں علاوہ بریں کم از کم 56 غیر ملکی باشندے بھی اس جنگ کا شکار ہو چکے ہیں جن میں سے 15 باشندے فرانسیسی تھے۔

چونکہ فرانسیسی حکومت الجزائری موجودہ غیر آئینی و غیر جمہوری فوجی حکومت کی حامی ہے اس لئے اسے پھر ہر لحہ یہ خدشہ ہے کہ فرانس میں موجودہ مسلم الجزائری باشندے جن کی پوری ہمدردی اور حمایت اسلامک سالویشن فرنٹ کے ساتھ ہے وہ فرانسیسی حکومت کے لئے مسائل پیدا کر سکتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ فرانسیسی حکومت نے الجزائری نژاد مسلم باشندوں کے خلاف زبردست جارحانہ مہم چھیڑ رکھی ہے۔ گذشتہ دنوں کثیر تعداد میں الجزائری مسلم نوجوانوں کا فرانس سے انخلاء اور عام طور پر مسلم باشندوں کے خلاف تادیبی کارروائی اور ان پر گہری نگرانی اس کے خوف کا پردہ فاش کرتی ہیں۔

فرانس کے موجودہ وزیر داخلہ چارلس پاسکا جو نسلی تعصب اور جارحانہ رویے کی لئے فرانسیسی نیو فاشسٹ حلقوں میں تحسین کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں اسلام دشمنی کے زبردست علمبردار ہیں۔ پاسکا کے مطابق ہر مسلم اپنے اندر بنیاد پرستی کا مادہ رکھتا ہے۔ لہٰذا وہ قابل تعزیر ہے۔ یہی سبب ہے کہ پاسکا کے حکم پر پورے فرانس میں اسلام سے تعلق رکھنے والا ہر شخص مشکوک بن چکا ہے اور بالخصوص الجزائری مسلم باشندے اور شمالی افریقہ سے آئے مہاجرین کے لئے فرانس کی زمین تنگ ہوتی جا رہی ہے گذشتہ دنوں کثیر تعداد میں فرانس میں مقیم مسلم نوجوانوں کی گرفتاری اور فوجی بیرکوں میں ان کے ساتھ جبر و زیادتی کا سلوک علاوہ بریں انہیں قانونی چارہ جوئی کے حق سے محروم رکھنے کے عمل سے فرانسیسی حکومت کے جارحانہ رویے کا صاف پتہ چلتا ہے۔

مبصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ فرانس کے ذریعہ الجزائر کی فوجی حکومت کی حمایت جاری رکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ وہ الجزائر میں اسلامک سالویشن فرنٹ کو اقتدار میں آنے سے روکے ہوئے رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ اسے یہ خدشہ ہے کہ اگر اسلامک سالویشن فرنٹ برسر اقتدار آگیا تو فرانس کے اشارے پر حرکت کرنیوالے الجزائری افراد اور

(باقی ص ۸ پر)

اسلامی اسکارف پر پابندی کے خلاف مسلم طالبات کا پرزور مظاہرہ

سپریم کورٹ کے فیصلے کی حقیقت کیا

ڈاکٹر ایم اسماعیل فاروقی (مدعی) بنام حکومت ہند ودیگر (مدعاعلیہ) ایکٹ بابت قبضہ آراضی مخصوصہ بمقام ایودھیا مجریہ 1993 دستور ہند فقرہ 245 ساتواں شیڈول فہرست سوم اندراج نمبر 42 جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کیا پارلیامنٹ قانون وضع کرنے کی مجاز تھی۔ یہاں قانون سازی کا موضوع ومواد "جائداد پر قبضہ پانا" ہے اور یہ کہ یہ پوری طرح اندراج نمبر 1 فہرست دوم کے دائرہ کار میں آتا ہے جس کا تعلق "پبلک آرڈر سے ہے (ملاحظہ ہو پیرا 29) دستور کے Baventh ترمیمی ایکٹ کے نتیجے میں مرقوم فہرست سوم کے مفصل اندراج 42 سے کسی شبہ کی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ قبضہ آراضی سے متعلق اس طرح کا کوئی ایکٹ واضح طور پر اس اندارج کے دائرہ کار میں آتا ہے اور اس لئے اس قانون کے نفاذ کے لئے پارلیامنٹ کے قانونی اختیار واستحقاق پر شک نہیں کیا جاسکتا (پیرا 31)۔ مذکورہ ایکٹ کی ذیلی دفعات 2(1) الف، 3 کے تحت یہ بحث اٹھی کہ متنازعہ جگہ سے متصل کسی آراضی کو تحویل میں لینے کا قانونی جواز ہے یا نہیں۔ جواب یہ ملا کہ:

متنازعہ جگہ سے قربت کے پیش نظر اس سے متصل مندر یا مذہبی عمارتیں جو بذات خود کسی خاص زمرہ میں آتی ہوں اگر انہیں تحویل میں لینے کی ضرورت پیش آئے تو یہ جائز ہے۔ پیرا (52)۔ مذکورہ ایکٹ کی ذیلی دفعات 3، 6 حصول کے مفہوم پر بحث کی گئی اس ضمن میں یہ وضاحت کی گئی کہ جیسا کہ پہلے کہا چکا ہے کہ لفظ حصول کے مفہوم کے مختلف پہلو ہیں جن پر اس کے سیاق اور محل استعمال کا اثر پڑتا ہے۔ ضروی نہیں کہ اس صورت میں اس سے مراد مکمل حصول ہو۔ اسی لئے اس کا استعمال محدود حصول کے معنوں میں بھی ہوسکتا ہے اور اس کا استحقاق اور مدت دونوں اعتبارات سے محدود ہوسکتا ہے پیرا (44)۔ لہذا اس ایکٹ کی دفعہ 3 کی رو سے متنازعہ جگہ کے تعلق سے مذکورہ بالا ایکٹ کی دفعہ 4(3)۔ دستور ہند فقرہ 14، 143(1) کی روشنی میں جس کا موضوع کسی جائداد کے حقوق ملکیت اور اس کے متعلقہ مفادات سے متعلق مرکزی حکومت کو ملے ہوئے اختیار کے سلسلے میں زیر غور مقدمات اور قانونی کارروائیوں کا سقوط ہے، سوال یہ ہے کہ کیا اس کا قانونی جواز ہے۔ اس پر کہا گیا کہ مرکزی حکومت کی تجویز یہ ہے کہ محولہ بالا سوال کا جواب ملنے کے بعد دونوں دعویدار فریقوں سے گفت وشنید کی جائے مقدمات اور قانونی کارروائیوں کے بدل ای کی اجازت مذکورہ استصواب کے لئے اختیار کردہ شرائط کی تکمیل کرکے دی جاسکتی ہے۔ ہمارے خیال میں تنہا یہی بات دستور کی دفعہ 4 کی ذیلی دفعہ (3) کے جواز کی نفی کرنے کے لئے کافی ہے۔ تاہم دفعہ 4 کی ذیلی دفعہ (4) کو ختم کیا جاسکتا ہے۔ اسی لئے باقی ماندہ قانون جسے جائز قرار دیا جاچکا ہو اس میں اس ذیلی دفعہ کا عوامی جواز کوئی رخنہ نہیں ڈالتا پیرا (65)۔ اس کے نتیجہ کے طور پر تمام زیر غور مقدمات اور

دستور ہند کے باب بعنوان سیکولرزم کے متن کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک کے آئینی نظام سے یہ بات واضح ہے کہ اس میں عقیدہ کے امتیاز سے قطع نظر مذہب کے معاملے میں تمام افراد اور گروہوں کو مساوات کی ضمانت دی گئی ہے اور اس پر تاکید کی گئی ہے کہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے پیرا (40) اگرچہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے لیکن تمام مذاہب کا یکساں احترام حکومت پر واجب ہے۔ ایک مذہب کے مفاد کو نظرانداز کرکے دوسرے مذہب کے مفادات کی طرف داری وپیروی نہیں کی جاسکتی (141)

مرکزی حکومت کی حیثیت ایک قانونی امین اور محصل کی ہے، تاہم متنازعہ جگہ سے زائد آراضی کا مرکزی حکومت کی تحویل میں لیا جانا مطلق اور قطعی ہے۔ ایکٹ کی رو سے محصل جملہ آراضی کے دو حصوں کے تعلق سے دفعہ 3 اور 6 میں لفظ حصول کے یہ مختلف معانی بیان کئے گئے ہیں (پیرا 62)۔

اور اگر ایسی بات چیت کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلے تو وہ کوئی ایسا طریقہ کار اختیار کرسکتی ہے جو حالات کے تقاضوں کے مطابق ہو۔ ان حالات میں بلاشبہ دستور کے آرٹیکل 143(1) کے تحت اختیار کردہ استصواب کی کارروائی کو موثر نعم البدل نہیں تصور کیا جاسکتا برچند کہ قرارداد پاس کرکے زیر غور قانون ان کا فیصلہ کیا جائے گا۔ ایکٹ کی دفعہ 4 میں بیان کردہ تفصیل سنی وقف بورڈ اور مسلم فرقہ کو پیروی کرنے اور مذکورہ طریقے سے مخالفانہ قبضہ رکھنے کے حق سے محروم رکھتی ہے اور استصواب کی راہ سے پوچھے گئے مخصوص سوال اور بعد کے مباحثوں کے جواب میں متنازع جگہ سے متعلق ان کی شکایات کی دادرسی پر پابندی لگاتی ہے اور ایکٹ کی دفعہ 3 کی تفصیلات جو اس مقصد کے حصول کے لئے مرکزی حکومت کو جملہ جائداد کا محصل قرار دیتی ہے۔ جمہوریت کے اصول کے منافی ہے (پیرا 140)

مذکورہ ایکٹ کی دفعہ 6 کے حوالے سے کسی دوسرے با اختیار فرد، ادارے یا ٹرسٹ کو حصول شدہ آراضی یا اس کے کسی حصہ کا محصل مقرر کرنے کے عمل کے جواز کے بارے میں یہ کہا گیا کہ اگر یہ معلوم ہو کہ متنازع جگہ کے علاوہ اس سے ملحق کسی آراضی کو حاصل کرنے کی جب ایک بار اجازت دیدی گئی تو ایسی حالت میں متنازع جگہ کے حصول کے مقصد کو موثر بنانے اور فریقین پر قانونی فیصلے کو نافذ کرنے میں ملحق آراضی کا حدود اربعہ پالیسی کے دائرہ اختیار میں آتا ہے اور یہ عدالتی چھان بین یا اس کے نفاذ کے آئینی جواز کی تصدیق کے لئے کوئی بنیاد فراہم نہیں کرتا (پیرا 60)۔ تمام تر دفعہ 7(2) کی قانونی حیثیت کو چیلنج کرنے کی کوئی حقیقی بنیاد موجود نہیں ہے پیرا (57) اس نتیجے کی حمایت میں کہ ایک مذہب کے مقابلے میں دوسرے مذہب کی طرفداری کرنے کے لئے ایکٹ کو مسخ کیا گیا ہے دفعہ کی وضاحتوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ (143)

دفعہ 8 کے تحت زمین کی بازاری قیمت کے حساب سے ادائیگی کے لئے کلیم کمشنر کے تقرر کے

24 اکتوبر 1994 کو سپریم کورٹ نے بابری مسجد سے متعلق صدارتی ریفرنس کو واپس کرتے ہوئے جو فیصلے سنائے اس سے ہندوستانی عدلیہ کے کردار کا بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے۔ سپریم کورٹ کا زیر بحث فیصلہ تین بنیادی نکات پر مشتمل ہے۔

اول یہ کہ صدر جمہوریہ ہند نے نرسمہا راؤ حکومت کی ایما پر 7 جنوری 1993 کو آئین کے دفعہ (143(1 کے تحت ایک نکاتی حوالے کے ذریعے سپریم کورٹ سے جو رائے طلبی کی تھی کہ "کیا بابری مسجد کی تعمیر سے قبل اس مقام پر کوئی مندر یا کوئی بھی ہندو ڈھانچہ موجود تھا؟" سپریم کورٹ نے اس حوالے کو غیر ضروری اور فالتو قرار دیتے ہوئے اسے واپس صدر کو بھیج دینے کا فیصلہ کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ سپریم کورٹ اس پر رائے دہی کو ضروری نہیں گردانتی۔

دوسرے یہ کہ سپریم کورٹ نے 7 جنوری 1993 کو ہی مرکزی حکومت کی جانب سے اجودھیا لینڈ ایکوزیشن ایکٹ 1993 کے تحت بابری مسجد

مذکورہ بالا ایکٹ اور استفسار ایک مذہبی فرقے کی طرف داری اور دوسرے مذہبی فرقے کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہذا اس استفسار کا مقصد غیر آئینی اور جمہوریت مخالف ہے۔ نیز یہ کہ اس استفسار سے کوئی آئینی مقصد بھی حل نہیں ہوتا۔ پیرا (154) اس صورت میں کہ اگر عدالت یہ سمجھتی ہو کہ متنازع جگہ پر متنازع عمارت کی تعمیر ہونے سے قبل وہاں کسی ہندو مندر یا عمارت کا وجود نہیں تھا پھر بھی یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہاں پر مسجد ازسر تعمیر کی جائے گی پیرا (155)

بقیہ: مغربی ایشیا کا امن درہم برہم ہو جائے گا

جاسکتی ہیں۔ مزید براں حماس کے کسی بھی کارکن کی موت ہزاروں فلسطینیوں کی نگاہ میں اسے ہیرو بنا دیتی ہے۔ اس طرح اگر کوئی کارکن شہید ہو جاتا ہے تو اسکی جگہ لینے کے لئے دسیوں سامنے آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے سمجھدار قسم کے اسرائیلی افسر ایسی کوئی صورتحال پیدا نہیں ہونے دینا چاہتے جس سے حماس کو فائدہ پہنچے۔

بہر حال حماس کے کارکنوں کو گرفتار کرنا یا انہیں گولیوں سے بھون دینا آسان نہیں ہوگا یہ چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بٹے ہوئے لوگ انتہائی پڑھے لکھے سمجھدار اور فوجی اعتبار سے تربیت یافتہ ہیں۔ پتہ لگالئے جانے کے بعد وہ بزدلانہ انداز میں خود کو حوالے کرنے کے بجائے مقابلہ کرنا زیادہ پسند کریں گے۔ اسرائیلی ایجنٹوں کو اس بات کا اندازہ اس وقت خوب ہو گیا جب انہوں نے ویکس مین کو رہا کرانے کے لئے اس خفیہ ٹھکانے پر حملہ کیا جہاں اسے رکھا گیا تھا۔ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ اس پرتشدد واقعے میں ویکس مین اور ایک اسرائیلی کمانڈر کے ساتھ تین فلسطینی جاں باز بھی جان بحق ہوگئے تھے۔

القسام بریگیڈ کے سرفروشوں کو احکام حماس کی اس لیڈرشپ کی طرف سے ملتے ہیں جو مغربی کنارے اور غزہ پٹی سے باہر رہتے ہے یعنی اردن، شام، لبنان، سوڈان اور ایران وغیرہ۔ موساد کے ایجینٹوں کو اس طرح کے لیڈروں کا پتہ لگا کر انہیں ٹھکانے لگانے کے احکام دے دیے گئے ہیں اسرائیلی افسر یہ اصرار کرتے ہیں کہ ان کے خفیہ ایجینٹوں کو اس طرح کے احکامات نہیں دیے گئے ہیں جیسے 1972 میں اسرائیل کے گیارہ کھلاڑیوں کو فلسطینیوں کے ذریعے قتل کر دیے جانے کے بعد دیے گئے تھے۔ اس وقت اسرائیلی حکومت نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ پی ایل او کے ان سولہ کمانڈروں کو جو اس کے بقول اس واقعہ کے ذمہ دار تھے ڈھونڈ کر ختم کر دیا جائے۔ اب سارے کمانڈر اس دنیا میں نہیں رہے۔ یا تو اسرائیلیوں نے انہیں ختم کر دیا یا فلسطینیوں کی آپسی لڑائی میں وہ کام آگئے۔

نئے قوانین سے اسرائیلیوں کو امید ہے کہ القسام کے سرگرم کارکنوں کو اب اپنی زندگی بچانے کے لئے کام کرنا پڑے گا اس کا مطلب ہے کہ انہیں بم بنانے اور اسرائیلی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کی کم ہی فرصت ملیگی۔ لیکن حماس کے کارکنوں کا کہنا ہے کہ انکے خلاف اسرائیل کی یہ جنگ کوئی نئی نہیں ہے۔ مغربی کنارے پر رہنے والے احمد نامی ایک فلسطینی کا جس کا القسام سے تعلق ہے کہنا ہے کہ اسرائیلی پہلے بھی ہمارا پیچھا کرتے اور قتل کرتے رہے ہیں، حماس میں شامل ہونے والا ہر شخص یہ طے کرکے آتا ہے کہ اسے ایک وقت جام شہادت نوش کرنا پڑسکتا ہے۔ احمد کا یہ بھی کہنا ہے کہ شہادت ہر مسلمان کی تمنا ہے۔ "اسرائیلیوں سے کہہ دو ہم ان سے خوفزدہ نہیں ہیں ان کی دھمکیاں کھوکھلی ہیں اور ہم بڑے آرام سے سوتے ہیں"۔

حماس کے اندر بعض ایسے عناصر بھی ہیں جو اسرائیل کے ساتھ امن مذاکرات میں پی ایل او کے ہمراہ شامل ہونا چاہتے ہیں لیکن احمد جیسے فلسطینی جنکا تعلق القسام برگیڈ سے ہے ایسی کسی بھی گفتگو کے خلاف ہیں۔ لیکن اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ حماس کے اندر اختلافات پیدا ہو رہے ہیں در اصل کسی بھی ایسی تنظیم کے مختلف افراد سے مختلف آوازیں سننے کو ملتی ہیں جنہیں کھلے طور پر کام کرنے کی اجازت نہ ہو۔ چونکہ تحریک انتفاضہ کے بعد ہی سے حماس کے کارکن اسرائیلی ایجنٹوں اور فوج کی زد پر رہے ہیں اس لئے انہوں نے ایک حکمت عملی کے تحت خود کو مختلف چھوٹے چھوٹے گروپوں میں بانٹ لیا ہے۔ بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو صرف سیاسی سطح پر سرگرم ہیں اور مسلح سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے۔ سیاسی سطح پر سرگرم یہ پڑھے لکھے لوگ تشدد کو پسند نہیں کرتے لیکن وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر دوسری جانب سے تشدد کے علاوہ کچھ اور نہ آرہا ہو تو پھر اس کے علاوہ انکے پاس راستہ بھی کیا رہ جاتا ہے۔ اتنی بات واضح ہے کہ پورے مغربی ایشیا میں تشدد کی ایک نئی لہر پھوٹنے والی ہے کیوں کہ اسرائیلی ایجنٹ مغربی کنارے اور غزہ پٹی کے علاوہ دوسرے ممالک میں رہنے والے حماس کے کارکنوں کو بھی نشانہ بنانے والے ہیں ظاہر ہے اس کے جواب میں حماس کے لوگ مزید حملے کریں گے۔

اس صورت حال کے پیش نظر بعض اسرائیلی اور ان کے مغربی ہمنوا کہتے ہیں کہ حماس کو نہ پہلے تشدد سے دبایا جاسکا ہے نہ آئندہ ایسا کوئی اقدام انہیں ختم کرسکتا ہے وہ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ حماس کو امن مذاکرات سے خارج کرکے غلطی کی گئی تھی تو اب ضرورت اس بات کی ہے کہ حماس کے ان عناصر سے ہاتھ ملالیا جائے جو مذاکرات کے ذریعے مسئلہ کا سیاسی حل چاہتے ہیں۔ لیکن کیا حماس کی نوجوان قیادت جو مسلح جد جہد کر رہی ہے اپنے بعض سیاسی لیڈروں کے کسی ایسے اقدام کو برداشت کریگی یا انہیں اسکی اجازت دیگی، یہ کہنا بہت مشکل ہے۔ پی ایل او کے پاس مذاکرات کے علاوہ کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ حماس چونکہ مغربی کنارے اور غازہ پٹی میں سرگرم ہے اس لئے وہ اسرائیلی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں ہے اور اسے اندر و باہر کے بے شمار ہمدردوں کی حمایت بھی حاصل ہے۔

اس شمارے کی قیمت: تین روپے
سالانہ چندہ ایک سو پچاس روپے / سو امریکی ڈالر
یکے از مطبوعات
مسلم میڈیا ٹرسٹ
پرنٹر پبلیشر، ایڈیٹر محمد احمد سعید نے
الفا آفیسٹ پریس سے چھپوا کر
دفتر ملی ٹائمز 49 ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر
نئی دہلی۔ 110025 سے شائع کیا۔
فون: 6827018

فیصلے کے اہم نکات کی تلخیص

اس تاریخی مسجد میں نماز ادا کرنے کے اپنے حق سے محروم کر دیے گئے بلکہ رفتہ رفتہ ایسے حالات پیدا کر دیے گئے کہ مسجد مندر میں تبدیل ہوتی گئی اور بالآخر مسجد کے پانچ سو سالہ تاریخی ڈھانچے کو بھی مسمار کر کے وہاں عبوری مندر کا قیام عمل میں آگیا۔ علاوہ بریں خود مرکزی حکومت اور فاشسٹ ہندو تنظیموں کی جانب سے اسے عظیم الشان مندر میں تبدیل کرنے کی مسابقانہ جدوجہد اور تیاریاں جس طرح جاری ہیں وہ بھی روز روشن کی طرح عیاں ہے، اور یہ سب کچھ عدلیہ کی آزادی وقار اور آئین کے سیکولر اور جمہوری کردار کی دہائی کے ساتھ ساتھ انجام پارہا ہے۔

ملی ٹائمز کے قارئین کے لئے پیش ہیں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بنیادی نکات اور اس کی تلخیص، جس سے ہمارے قارئین خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ سپریم کورٹ کے فیصلے کے ظاہر و باطن میں کیا ہے؟ اس فیصلے کو کس کی فتح اور کس کی شکست سے تعبیر کیا جاسکتا ہے؟

کوئی جھول نہیں ہے جس کی رو سے اسے غیر آئینی قرار دیا جاسکتا ہے۔ پیرا (61)۔

دستور ہند کے آرٹیکل 14 بعنوان سیکولرزم کی دفعہ 7 کے تحت یہ سوال اٹھایا گیا ہے کہ متنازع جگہ پر حالت قائمہ کو بحال رکھنے کے تحت دفعہ 7 میں وضاحت کردہ حکم جمہوریت مخالف یا امتیاز پسندانہ فصل تھا جو اس وضاحت کو غیر آئینی بنا دیتا ہے۔

اس کے جواب میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ بات ذہن نشین رکھنے کے قابل ہے کہ 6 دسمبر 1992 کو مسجد کے انہدام کے ذمہ دار افراد (بعض ایسے جرائم پیشہ تھے جن کی شناخت نہیں کی جاسکتی) اور اسے ان کو تمام تر ہندو فرقے کے برابر نہیں سمجھا جاسکتا۔ لہٰذا نفاذی آئینیت کے بارے میں کوئی فیصلہ دینے کے مقصد سے بعض شرپسند عناصر کی غنڈہ گردی کے مظاہرے کو پورے ہندو فرقے کا عمل قرار نہیں دیا جاسکتا پیرا (55)۔ مذکورہ دفعہ میں پیش کردہ وضاحت مسلم فرقے کو متنازع جگہ پر عبادت کرنے کے حق کو ختم نہیں کرتا اور جو صورت حال 7 جنوری 1993 کو تھی اس کی مطابق یہ دفعہ حالت قائمہ کو بحال کرتی ہے پیرا (56) اس لئے سیکولرزم اور حق مساوات مذہبی آزاد کے نام پر خصوصاً کلیم کمشنر کا اخذ کردہ نتیجہ حتمی ہوگا اور کچھ ہوسکتا ہے تو صرف یہ کہ دستور کی دفعہ 227 / 226 کے تحت چارہ جوئی کی جائے۔ مذکورہ بالا وجوہ کی بنا پر دفعہ 4 اور 8 کی وضاحتوں کو خود ساختہ اور غیر معقول سمجھا جانا چاہئے۔

دستور کے آرٹیکل 143(1) کے تحت بابری مسجد کی تعمیر نو سے پہلے ہندو مندر کے وجود کی تصدیق سے متعلق استصواب کی تائید کے بارے میں حسب ذیل فیصلہ لیا گیا۔

ایکٹ 33 مجریہ 1993 کے قانونی جواز کے سلسلے میں قائم کردہ اپنی رائے اور دفعہ 4(3) کے علاوہ پورے وضعی قانون کے جواز کو برقراری کے نتیجے میں آرٹیکل 143(1) کے تحت کیا گیا استفسار مضحکہ خیز اور غیر ضروری ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے مذکورہ استصواب کی سماعتی صلاحیت سے متعلق دیے گئے بیانات کی صحت کی تحقیق غیر ضروری ہے۔ (پیرا 86)

مذکورہ بالا ایکٹ اور استفسار ایک مذہبی فرقے کی طرف داری اور دوسرے مذہبی فرقے کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا اس استفسار کا مقصد غیر آئینی اور جمہوریت مخالف ہے۔ نیز یہ کہ اس استفسار کے کوئی آئینی مقصد بھی کار نہیں ہوتا۔ پیرا (154)

اس صورت میں کہ اگر یہ عدالت یہ سمجھتی ہو کہ متنازع جگہ پر متنازع عمارت کی تعمیر ہونے سے قبل وہاں کسی ہندو مندر یا ہندو عمارت کا وجود نہیں تھا پھر بھی یہ بات یقینی نہیں ہے کہ وہاں پر مسجد از سر نو تعمیر کی جائے گی پیرا (155)

دونوں موقفوں کی نمائندگی کرنے والے اہم دعویدار استفسار میں حاضر نہیں ہو رہے ہیں۔ نہ ہی وہ کوئی ثبوت فراہم کریں گے اور نہ ہی سوال و جواب کا تبادلہ کریں گے۔

اس طرح کے اندازوں پر عدالتی رائے دینے کی حمایت نہیں کی جاسکتی اور اس کے علاوہ یہ بھی ہے کہ ایسی کوئی رائے ایک یا دونوں فریقوں کی تنقید کا نشانہ بنے گی کہ ان کے بیانات اور ثبوتوں کو سنے اور دیکھے بغیر یہ رائے صادر کردی گئی۔ پیرا (156)

تحفظ 25 اور 26 کی رو سے مسجد چرچ اور مندر جیسی عبادت گاہوں کو ریاست اقتدار اعلی کی حیثیت سے اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ ہندوستان میں زیر عمل اسلامی شریعت کے مطابق مخالفانہ قبضہ کے ذریعہ کسی مسجد کے حق ملکیت سے محرومی ممکن ہے۔ اس خیال کے پیچھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلے میں مسجد کو جمہوری ہندستان میں کوئی منفرد اور خصوصی درجہ حاصل ہے اور اسے ریاست یا اقتدار اعلی کے خصوصی اختیارات کی پہونچ سے دور رکھتے ہوئے ریاستی تحویل میں نہیں لیا جاسکتا۔

دستور ہند کے باب بعنوان سیکولرزم کے متن کے حوالے سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ ملک کے آئینی نظام سے یہ بات واضح ہے کہ اس میں عقیدہ کے امتیاز سے قطع نظر مذہب کے معاملے میں تمام افراد اور گروہوں کو مساوات کی ضمانت دی گئی ہے اور اس پر تاکید کی گئی ہے کہ سیکولرزم کے معنی ہیں پیرا (40)۔ اگر چہ ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہے لیکن تمام مذاہب کا یکساں احترام حکومت پر واجب ہے۔ ایک مذہب کے مفاد کو نظر انداز کر کے دوسرے مذہب کے مفادات کی طرف داری و پیروی نہیں کی جاسکتی (141)۔

اس لئے اگر ایک مذہب سے وابستہ ہندوستانی شہریوں کی اکثریت دوسرے مذہب سے وابستہ شہریوں کی عبادت گاہ پر حملہ آور یا دعویدار ہوتی ہے تو آئین کے تحت ریاست کو اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ امن عامہ کے تحفظ کے لئے اس عبادت گاہ کو اپنی تحویل میں لے لے۔

دستور کے آرٹیکل 35، 66 کے تحت یہ سوال اٹھایا گیا کہ کیا مسجد پر قبضہ دستور ہند کے آرٹیکل 25 اور 26 کی وضاحتوں کے تحت حاصل حقوق کی پامالی نہیں ہے۔

اس کی صراحت ان الفاظ میں کی گئی کہ بشرطیکہ تحفظ 25 اور 26 کی رو سے مسجد چرچ اور مندر جیسی عبادت گاہوں کو ریاست اقتدار اعلی کی حیثیت سے اپنی تحویل میں لے سکتی ہے۔ ہندستان میں زیر عمل اسلامی شریعت کے مطابق مخالفانہ قبضہ کے ذریعہ کسی مسجد کے حق ملکیت سے محرومی ممکن ہے۔ اس خیال کے پیچھے کوئی معقول وجہ نظر نہیں آتی کہ دیگر مذاہب کی عبادت گاہوں کے مقابلے میں مسجد کو جمہوری ہندستان میں کوئی منفرد اور خصوصی درجہ حاصل ہے اور اسے ریاست یا اقتدار اعلی کے خصوصی اختیارات کی پہونچ سے دور رکھتے ہوئے ریاستی تحویل میں نہیں لیا جاسکتا۔

****

سے آخری عدالتی فیصلہ کی شرائط کے مطابق یہ آراضی مقدمے میں کامیاب ہونے والے فریق کے حوالے کی جائے گی۔ اس مقصد کے لئے حق ملکیت کا ثبوت قانونی عدالت میں پیش کرنا چاہئے اور وہ

چونکہ مرکزی حکومت نے ہی قانونی محصل کی حیثیت سے متنازع جگہ کو اپنی تحویل میں لیا ہے اس لئے اس آراضی کے کسی معاوضہ کی ادائیگی کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عدالتی فیصلے کے درست نفاذ کی غرض سے آخری عدالتی فیصلہ کی شرائط کے مطابق یہ آراضی مقدمے میں کامیاب ہونے والے فریق کے حوالے کی جائے گی۔

سپریم کورٹ کو بھی مسلمانوں کے مذہبی مقامات کے تحفظ سے کوئی دلچسپی نہیں

ت سے متنازع جگہ کو اپنی ... لئے اس آراضی کے کسی ... نہیں پیدا ہوتا۔ اس کی وجہ ... کے درست نفاذ کی غرض

بھی کسی کلیم کمشنر کی موجودگی میں جسے مرکزی حکومت مقرر کرے گی اور وہ کمشنر اپنا ذاتی طریق کار وضع کرے گا۔ اپیل یا سول کورٹ سے استفسار کا حق بھی نہیں دیا گیا ہے کیونکہ دفعہ 6 میں بھی ایسا

... قربت کے پیش نظر اس سے متصل مندر یا ... جو بذات خود کسی خاص زمرہ میں آتی ہوں اگر ... لینے کی ضرورت پیش آئے تو یہ جائز ہے۔

بقیہ: کیا گورباچوف پھر روس کے صدر ہوں گے؟

روسی حکمرانوں کے درمیان۔ وہ حقیقی اصلاح کی راہ سے بھٹک جانے کے نتیجے میں ملنے والی ناکامیوں کے بعد خود کو محفوظ رکھنا چاہتے ہیں۔

سوال: کیا اس کا امکان ہے کہ آپ عہدہ صدارت کے لئے امیدوار ہوں۔

جواب: یہ سوچنا روسی عوام کا کام ہے۔ میں اپنے ارادے ابھی ظاہر نہیں کروں گا۔ میری طرف سے عوام کو اس فیصلہ کی اجازت ہے کہ وہ ایسا چاہتے ہیں کہ نہیں۔

سوال: کیا مغرب کو روس میں بڑھتی ہوئی قوم پرستی سے نام نہاد "خارج قریب" کے سیاق میں فکر مند ہونا چاہئے۔

جواب: مغرب کو کسی اور ہی بات سے فکر مند ہونا چاہئے۔ انہیں اس طرف سے تشویش لاحق ہونی چاہئے کہ کہیں سوویت یونین کی سابقہ جمہوریتیں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنا بند نہ کردیں اور ان کے درمیان باہمی ربط کہیں ختم نہ ہوجائے۔ سوویت یونین ہرگز دوبارہ نہیں پیدا ہوگا۔ اور اسی طرح روسی ریاست بھی دوبارہ وجود میں نہیں آئے گی۔ لیکن معقول تعاون اقتصادی ثقافتی اور آگے چل کر دفاعی میدانوں میں باہمی تعاون ضرور ممکن ہے۔ لیکن میرا خیال ہے کہ باوجود اس کے کہ میں اس دن کے انتظار میں ہوں جب ایک نیا وفاق وجود میں آئے گا، ایک سوویت یونین کی تعمیر حد درجہ مشکل کام ہے۔ خصوصاً روس میں بعض لوگ سوچتے ہیں کہ یہ روس کی طرف سے دھمکی ہے جو جمہوریتوں کو دوبارہ ایک وحدت بنانا چاہتا ہے۔ لیکن روس میں ہی لوگوں کی بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو ایک نئے اتحاد کی تشکیل کے حق میں نہیں ہیں۔ نہ صرف تمام لیڈران بلکہ عوام بھی اسی انداز پر سوچ رہے ہیں۔ کیونکہ ان کے وسائل بہت محدود ہیں اگر انہیں دوبارہ متحد ہوکر رہنا پڑا تو ان کے وسائل میں باقی لوگ بھی شریک ہوں گے۔ میں ذاتی طور پر ایک نئے اتحاد کو وجود پاتے ہوئے دیکھنا چاہوں گا جو یوکرین، قزاخستان اور بیلاروس پر مشتمل ہوگا۔ یوکرین کی خود مختار ملک کی حیثیت برقرار رہے گی اور اسی طرح بیلاروس اور قزاخستان کی اتحادی حیثیت بھی بحال رہے گی۔ اگر ایسا نہیں ہوا تو پھر کوئی بات بھی ممکن ہے نئی جمہورتیں بھی ٹوٹ کر الگ ہوسکتی ہیں۔

سوال: کیا روس ناٹو کا ممبر بنے گا؟

جواب: ناٹو بنیادی طور پر ایک مغربی حربہ ہے اور صرف سولہ ممالک کا آلہ کار ہے جب کہ یوروپ میں چوون ممالک ہیں۔ ایسی کوئی کوشش بہت ضروری ہے جو ناٹو کے پرانے رول کو پھر سے زندہ کرسکے اور اسے یوروپی استحکام کے ضامن کا مقام دوبارہ عطا کرسکے۔ ناٹو کو باقی رہنے دیں اور سی آئی ایس کے اندر دفاعی اتحاد، مغربی یوروپی اتحاد اور ان جیسی تمام تنظیموں کو زندہ رہنے دیں۔ لیکن امن کی حصہ داری یعنی ناٹو اور سابق معاہدہ وارسا میں شریک ممالک کے درمیان تعاون کا امریکی منصوبہ ایک ایسی چیز ہے جس کا میں شدید مخالف ہوں کیونکہ اس کا جو خاکہ میرے ذہن میں ہے اس سے وہ بہت مختلف ہے۔

بقیہ: الجزائر

بڑھانے کا زبردست حوصلہ بخشتا ہے۔ الجزائر میں بے محنت کی آمدنی نے ایسے کسی حوصلہ اور جذبے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی اور اس کا غیر متوقع نتیجہ یہ ہے کہ یہاں کے عوام اپنے دو عرب پڑوسیوں کے مقابلے میں بڑی بدتر حالت میں ہیں۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی۔ تیل کی تجارت میں موڑ آئے بغیر بھی الجزائر کو ایک دیرپا سیاسی نظام کی تشکیل کے لئے جدوجہد کرنی پڑے گی۔ یہ جدوجہد بہت سی پر اشتیاق نگاہوں کے سامنے جاری رہے گا لیکن کم از کم یہ امکان پیدا ہو چلا ہے کہ اس سمت میں کوئی کوشش سکون کے ساتھ کی جاسکے گی۔

جنوبی افریقہ سے پھوٹتی اسلامی اتحاد کی نئی کرن

اسلامک کالج آف سدرن افریقہ کی شاندار عمارت: یہاں اسلامی علوم کے چراغ روشن ہیں۔

مسلمانوں کی باہمی اتحاد کی خواہش کی جڑیں بہت گہری ہیں کیونکہ اس کی بنیاد اس قرآنی حکم پر ہے کہ مسلمان ایک امت ہیں اور انہیں صرف اللہ سبحانہ تعالیٰ کی عبادت کرنا چاہیے (21:92) اس سے پہلے کی ایک آیت میں اللہ نے اہل ایمان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے دشمن تھے لیکن اس نے اپنی رحمت سے ان کے دلوں میں محبت کا جذبہ پیدا کردیا اور انہیں اخوت و بھائی چارے کے رشتے سے باندھ دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایسی کئی احادیث ہیں جس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو باہم متحد ہونے، ایک دوسرے کے معاملے اور دکھ سکھ میں شریک ہونے اور ایک امت کی حیثیت سے اپنے امور انجام دینے کی تلقین فرمائی ہے۔ اتحاد کی اس خواہش کی ایک اور بنیاد یہ آیت قرآنی بھی ہے کہ "اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑے رکھو اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو" (3:3)

دنیائے اسلام پر ایک سرسری نگاہ سے بھی یہ اندازہ لگانا مشکل نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں اتحاد کا فقدان ہے۔ تقریباً پچاس مسلم قومی ریاستوں کا وجود امت کے تصور کی پوری طرح نفی کر رہا ہے۔ ان ممالک کی حکومتیں وسیع تر امت کے مفادات کے بجائے اپنے قومی اغراض و مفادات سے سروکار رکھتی ہیں لیکن قومی ریاستوں کو امت کے تصور کے مساوی سمجھ لینا بہت بڑی غلطی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کا تصور ملک یا ریاست کے مقابلے

ایک لکچرر سے ایوارڈ حاصل کرتے ہوئے روانڈا کا ایک طالب علم

میں کہیں زیادہ وسیع ہے اور اس تصور کا مظاہرہ مختلف شکلوں میں ہوتا ہے مثال کے طور پر بوسنیا ہرزگونیا، کشمیر اور فلسطین میں اپنے بھائیوں کے انجام کی طرف سے دنیا بھر کے مسلمانوں کو تشویش

> یہ کالج قوم کے وسائل سے اپنی مالی ضروریات کی تکمیل اور تدریسی عملے کی کفالت کرتا ہے۔ یہ بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے کیوں کہ اکثر و بیشتر اس نوعیت کی کوششیں اسلام کے آفاقی تصور کے بجائے اپنے متعصبانہ نظریات کے فروغ میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے پر ہوس مطالبات کی نذر ہو جاتی ہیں۔

اور تعلق خاطر ہونا چاہیے۔

امت میں انتشار و تفریق کا اظہار ایک اور سطح پر بھی ہوتا ہے اور وہ ہے تعلیم، خصوصاً مذہبی تعلیم

پورے عالم اسلام میں بہت سی تعلیمی درس گاہیں ہیں اور ان میں بعض بین الاقوامی شہرت کی حامل ہیں جن میں مصر کی جامعہ ازہر سرفہرست ہے۔ اسی طرح تونس کی القریوم یونیورسٹی، شام میں دینی تعلیم کی جامعات اور کالج، سعودی عرب، ایران اور ہندوستان کے کئی ادارے مثالی حیثیت رکھے ہیں۔ ان تمام اداروں کے طریقہ تعلیم کا ایک مشترکہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ وہاں کسی مخصوص مکتب فکر کے مطابق ہی اسلام کی تعلیم دی جاتی ہے ایسا کوئی ادارہ نہیں ملے گا جہاں تمام تسلیم شدہ مکاتب فکر کے مطابق تشنگان علم میں اسلام کی فہم پیدا کی جاتی ہو اور تمام مکاتب کو یکساں احترام دیا جاتا ہو۔

ظاہر ہے کہ کسی مخصوص مکتب فکر کے مطابق اسلام کی تفسیر و تشریح کرنے کے علاوہ بھی ہمیں اسلام کے تعلق سے اور بہت کچھ کرنا ہے۔ بعض ادارے تو ایسے ہیں کہ اگر کسی دیگر مذاہب مسالک ان میں کسی سطح پر پڑھائے جاتے ہیں تو اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی خامیوں کو اجاگر کیا جائے اور خود اپنے مسلک کی برتری ثابت کی جائے۔ اور یہ بات بھی امت کے فکری عمل میں تفریق اور غیر ہم آہنگی کی دلیل ہے

لیکن اگر عالم اسلام کی صورت حال مایوس کن ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ اس کا اطلاق دنیا کے دیگر حصوں کے مسلمانوں پر بھی کیا جائے۔

حالیہ واقعات نے ہم پر یہ انکشاف کیا ہے کہ مسلمان دنیا میں جہاں کہیں بھی اقلیت میں ہیں وہاں وہ اس طرح کے چھوٹے موٹے اور فروعی اختلافات میں الجھنے کے بجائے ان سے بالاتر ہیں۔ اس کی ایک روشن مثال جنوبی افریقہ کے شہر کیپ ٹاون میں بعض لوگوں کی طرف سے کی گئی جرآت مندانہ اور حوصلہ افزا کوشش ہے۔ یہ کوشش اسلامک کالج آف سدرن افریقہ (اکوسا) کی شکل میں چار سال سے جاری و ساری ہے۔ اس کالج کا تعمیری منصوبہ کئی سالوں میں مکمل ہوگا جب کہ 189 طلباء پہلے ہی داخلہ لے چکے ہیں۔ مقامی لڑکوں اور لڑکیوں کے علاوہ کینیا، نائیجیریا، روانڈا، ملاوی، زمبابوے اور زامبیا سے آئے ہوئے طلباء کی تعداد بھی خاصی ہے۔

کالج کے منتظمین امت کے اتحاد کی صرف بات ہی نہیں کرتے بلکہ وہ عملاً اپنی زندگی اور نصاب تعلیم کا حصہ بھی بناتے ہیں۔ یہاں ہر مذہب و مسلک سے تعلق رکھنے والے اساتذہ دیکھے جاسکتے ہیں جو مسلکی تعبیرات اور تعصبات سے بالا تر ہو کر طلباء میں اسلام کے تئیں وسیع تر بصیرت پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے۔ کالج کے پرنسپل اور اس کی انتظامیہ کی ایک اہم شخصیت شیخ سعد اللہ خاں نے بتایا کہ اسلامک کالج آف سدرن افریقہ کا قیام علم پرستی کے مختلف گذشتہ، موجودہ اور آئندہ دھاروں کو احترام بخشنے اور معتدل طرز عمل وضع کرنے کی حقیر سی کوشش ہے۔ یہ کوشش نہ

> اسلامک کالج آف سدرن افریقہ کا قیام علم پرستی کے موجودہ اور آئندہ دھاروں کو احترام بخشنے اور معتدل طرز عمل وضع کرنے کی کوشش ہے۔ یہ کوشش نہ روایت میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ تجدیدی اور اختراعی فکر کا گلا گھونٹ دے اور نہ اتنی قیاس پرست ہے کہ اسلام کے عملی مطالعے کو تنقیدی تشکیک کا ذہنی سرکس بنا کر رکھ دے۔

روایت میں اس قدر ڈوبی ہوئی ہے کہ تجدیدی اور اختراعی فکر کا گلا گھونٹ دے اور نہ اتنی قیاس پرست ہے کہ اسلام کے عملی مطالعے کو تنقیدی تشکیک کا ذہنی سرکس بنا کر رکھ دے۔

کالج میں پڑھائے جانے والے نصاب تعلیم سے اس فکر کا بخوبی اظہار ہوتا ہے۔ اس نصاب میں عربی زبان، شریعت، علم کلام، اصول فقہ، سیرت، قرآنی علوم، حدیث، دعوت و اخلاق، تقابل ادیان، سماجی علوم اور قانون شامل ہیں۔ ذریعہ تعلیم عموماً انگریزی ہے لیکن عالمیت کے چار سالہ کورس میں تیسرے سال سے عربی زبان ذریعے تعلیم ہو جاتی ہے۔ کالج کی سرگرمیوں کا ایک قابل ستائش پہلو یہ بھی ہے کہ طلباء کے ذہن مسلکی اختلافات سے زہر آلود نہیں کیے جاتے بلکہ فکر و مطالعے کے مختلف رجحانات و انداز کی حیثیت سے انہیں پیش کر کے قرآن، سنت، فقہ اور شریعت کے گہرے مفاہیم تک طلباء کو رسائی کے قابل بنایا جاتا ہے۔ انہیں مختلف مکاتیب فکر کے انداز استدلال کو پرکھنا سکھایا جاتا ہے تاکہ کالج سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد کوئی طالب علم کٹر وہابی، بریلوی، دیوبندی، اور شیعہ یا سنی بن کر نہ رہے۔

یہ کالج قوم کے وسائل سے اپنی مالی ضروریات کی تکمیل اور تدریسی عملے کی کفالت کرتا ہے۔ یہ بذات خود ایک بڑا کارنامہ ہے کیونکہ اکثر و بیشتر اس نوعیت کی کوششیں اسلام کے آفاقی تصور کے بجائے اپنے متعصبانہ نظریات کے فروغ میں دلچسپی رکھنے والے افراد کے پر ہوس مطالبات کی نذر ہو جاتی ہیں۔

عین ممکن ہے کہ اقلیتی حیثیت میں رہنے والے مسلمان ہی ایک ایسے ماحول کی تخلیق میں پیش قدمی کریں جس میں اسلام کو اپنے قدیم تقدس کے ساتھ ابھرنے کا موقع ملے۔ اور جس دن یہ امکان حقیقت میں بدلے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلامک کالج آف سدرن افریقہ سے پھوٹتی ہوئی شعائیں پوری امت کو روشن کر رہی ہیں۔

بقیہ: پائیدار امن کا ضامن

ابراہیم کے نمازیوں کو عین حالت نماز میں گولیوں سے بھن دیا تھا تو اسرائیلی فوج نے یہودیوں کی حفاظت کے لئے سخت قوانین بنائے جن کی وجہ سے جگہ جگہ چیک پوسٹ بن گئے اور عام فلسطینیوں پر دسیوں پابندیاں عائد ہو گئیں۔ لیکن یہودیوں کو گھومنے پھرنے کی پوری اجازت ہے۔ ان پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ جب تک یہ صورتحال باقی رہتی ہے یعنی جس وقت تک یہودی آبادیاں وہاں قائم ہیں الخلیل پر پی ایل او کا اقتدار قائم نہیں ہو سکتا۔ اسرائیلی وزیر اعظم کو بھی اس کا احساس ہے او انہوں نے کم از کم اتنا کہا ہے کہ وہ الخلیل قصبے کے اندر آباد یہودیوں کو وہاں سے باہر نکال لیں گے۔

اوپر بیان کی گئی صورتحال کے پیش نظر اسرائیلی بعض ایسی تجاویز پیش کر رہے ہیں جو ستمبر 1993 میں طے پائے اصولوں کے خلاف ہیں۔ مثلاً وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ انتخابات اسرائیلی فوج کی موجودگی میں بھی منعقد کئے جاسکتے ہیں۔ یا یہ کہ اسرائیلی فوج عارضی طور پر ہٹائی جاسکتی ہے یا پھر یہ کہ بعض علاقوں میں انتخابات ہوں اور بعض میں نہ ہوں لیکن ظاہر ہے کہ اسرائیل یہ سب اپنے اندرونی مسائل سے بچنے کے لئے کہہ رہا ہے۔ اور اگر اسرائیل کی مذکورہ تجاویز میں سے کوئی بھی مان لی جائے تو انتخابات کا مقصد ہی فوت ہو جائے گا۔ صرف حماس ہی نہیں۔ پی ایل او کے حامی بھی ایسے کسی انتخات کی حمایت نہیں کرتے جس میں سارے فلسطینیوں کی آزادانہ شرکت ممکن نہ ہو۔ کیونکہ وہ ایک ایسا چاہتے ہیں جسے وہ "قومی" کہہ سکیں نہ کہ میونسل کارپوریشن کا انتخاب۔

لنگڑے لولے امن معاہدے کو پی ایل او اور اسرائیل نے اپنی اپنی مجبوریوں کے تحت ابھی تک نبھایا ہے۔ مذکورہ بالا مسئلہ بھی اپنی انہیں مجبوریوں کے پیش نظر شاید وہ حل کرلیں۔ مگر ایسی موقع پرستانہ پالیسیوں سے حقیقی اور پائدار امن بہر حال قائم نہیں ہو پائے گا۔

ضروری وضاحت

ملی ٹائمز کے 3 تا 17 اکتوبر 94 کے شمارے میں پروفیسر اقبال انصاری کا مضمون "ہندو مسلم تعلقات کل اور آج کے تناظر میں" دراصل انگریزی میں لکھا گیا تھا جسے ہمارے ایک محترم رفیق نے عام فہم اردو میں منتقل کیا تھا۔ مصنف نے بعض اصطلاحات کے ترجمے کے سلسلے میں اپنی بے اطمینانی کا اظہار فرمایا ہے اور بقول ان کے ترجمے نے بعض غلط فہمیاں پیدا کر دی ہیں۔ اس سلسلے میں کسی غلط فہمی کے ازالے کے لئے مصنف سے براہ راست رابطہ فرمائیں۔

(ادارہ)

پتہ:- پروفیسر اقبال انصاری 4/1703 منزل منزل، دودھ پور، علی گڑھ۔ فون: 400425(0571)

کلنٹن اسد کو دھونس دینے میں ناکام

امریکی صدر کلنٹن کے دورۂ مغربی ایشیا پر تازہ ترین رپورٹ

یہ بات فطری تھی کہ صدر بل کلنٹن مغربی ایشیا کا اپنا پہلا دورہ مصر سے شروع کرتے کیوں کہ اسرائیل کے ساتھ معاہدہ امن کرنے کے بعد ہی سے مصر عرب دنیا میں امریکی اور مغربی مفادات کی مسلسل حفاظت کرتا رہا ہے۔ چونکہ صدر کلنٹن اردن کے شاہ حسین اور اسرائیلی وزیراعظم اسحق رابن کی دعوت پر مغربی ایشیا آئے تھے اس لئے زیادہ فطری بات یہ ہوتی کہ وہ سب سے پہلے اردن جاتے جہاں اردن اسرائیل معاہدہ امن پر دستخط ہونے تھے مگر اس چیز کو نظرانداز کرکے کلنٹن پہلے مصر گئے کیونکہ امریکہ کی نظر میں حسنی مبارک ایک زیرک اور منجھے ہوئے سیاست داں ہیں۔ صدر کلنٹن سے مبارک نے تقریباً چار گھنٹے تک مختلف عرب مسائل پر گفتگو کی امریکی افسروں کا یہ عام تاثر ہے کہ اس گفتگو سے ان کے صدر کو کافی فائدہ پہنچا۔ اس موقع پر صدر کلنٹن نے یاسر عرفات کو بھی بلا بھیجا تھا۔ عرفات نے مبارک اور کلنٹن کے دباؤ میں آکر حماس کی، بقول انکے، انتہاپسندانہ سرگرمیوں کی مذمت کی۔

مصر کے بعد صدر کلنٹن اردن پہنچے جہاں وادی عربہ میں اسرائیل اور ان کے درمیان پہلے سے طے پائے ہوئے امن معاہدے پر بطور گواہ انہیں دستخط کرنے تھے۔ اردن اور اسرائیل کے ذمہ داروں نے اس موقع کو کافی علامتی بنا رکھا تھا۔ کیونکہ وہ کیمپ جہاں صدر کلنٹن اردن اور اسرائیل کے حکمراں اور دوسرے مہمانان ٹھہرائے گئے تھے وہ بارودی سرنگوں سے گھرا ہوا تھا۔ دراصل کیمپ تک جانے کا راستہ بہت ساری بارودی سرنگوں کو ہٹا کر بنایا گیا تھا۔ پھر بھی کیمپ سے چند گز کی دوری پر ایسی بہت ساری سرنگیں موجود تھیں۔ اس علامتی صورت حال کے ذریعے کیمپ کے ذمہ داران یہ پیغام دینا چاہتے تھے کہ وہ جس امن معاہدے پر دستخط کر رہے ہیں وہ خطرات سے گھرا ہوا ہے۔

کلنٹن حافظ الاسد کے ساتھ۔ اسد کی سوجھ بوجھ نے کلنٹن کے ہوش اڑا دیئے

اردن اور اسرائیل کے ذمہ داران اپنے اس تجزیے میں کافی حد تک صحیح بھی تھے کیوں کہ اسی دن جنوبی لبنان میں حزب اللہ کے جاں بازوں نے اسرائیلی فوج پر حملہ کیا مزید براں غزہ پٹی میں یاسر عرفات کی اپیل پر ایک عام ہڑتال منائی گئی۔ عرفات دراصل معاہدے کی اس شق کے خلاف احتجاج کر رہے تھے جن کے مطابق یروشلم میں مسلمانوں کی عبادت گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری کا اردن کو خصوصی حق حاصل ہو جاتا ہے۔ پی ایل او کو اندیشہ ہے کہ اس شق کے ذریعے اردن یروشلم کو آزاد فلسطینی ریاست کا دارالحکومت بننے کے بجائے اسرائیل کا حصہ بنا دینا چاہتا ہے۔

اردن اسرائیل معاہدے کو دونوں ملکوں کی پارلیامنٹ سے منظوری مل گئی ہے۔ خصوصاً اردن کی پارلیامنٹ میں اس مسئلے پر زبردست بحث ہوئی۔ لیکن جب آخری ووٹنگ ہوئی تو معاہدے کے حق میں 55 اور مخالفت میں 35 ووٹ پڑے۔ یہ وہی ممبران ہیں جنہوں نے ٹ کلنٹن کے اردنی پارلیامنٹ سے خطاب کا بائیکاٹ بھی کیا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ خود اردن میں بھی اسرائیل کے خلاف کافی جذبات پائے جاتے ہیں۔ اور بہت ممکن ہے کہ کسی مناسب موقع پر یہ چنگاری شعلے میں نہ تبدیل ہو جائے۔

بہر حال ان علامتی اور حقیقی خطرات کے باوجود صدر کلنٹن نے مغربی ایشیا کا دورہ جاری رکھا دورے کا ایک مقصد امریکہ کی اندرونی سیاست پر اثرانداز بھی ہونا تھا جہاں سینٹ اور کانگریس کے لئے درمیانی مدت کے ضمنی انتخابات ہو رہے ہیں۔ چونکہ انتخابی مہم کے دوران یہ بات روز بروز واضح ہوتی جارہی ہے کہ اندرون خانہ کلنٹن کی ناکام پالیسیوں کی وجہ سے ان کی پارٹی آئندہ انتخابات میں شکست کھا جائے گی۔ خارجی محاذ پر زبردست کامیابی کے ذریعے کلنٹن امریکی ووٹروں کو متاثر کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اور ان کے حامی دورے کی تفصیلات کو کافی بڑھا چڑھا کر پیش کر رہے ہیں۔

یوں تو کلنٹن کو چھ ملکوں کا دورہ کرنا تھا جن میں سے پانچ یعنی مصر، سعودی عرب، کویت، اسرائیل اور فلسطین تو امریکی حلیف ہیں البتہ شام ایک ایسا ملک ہے جس کی اپنی آزادانہ پالیسی ہے اور یہیں امریکی صدر کی ذہانت اور سفارتی سوجھ بوجھ کا اصل امتحان ہونا تھا۔ شام کے دورے پر جانے سے پہلے خود امریکہ میں صدر کلنٹن کے فیصلہ کو ہدف تنقید بنایا گیا تھا کیوں کہ شام اب بھی امریکی نقطہ نظر سے ان ممالک کی فہرست میں شامل ہے جنہیں واشنگٹن دہشت گرد قرار دیتا ہے۔ اس لئے بہت سارے ایسے لوگ جو اب بھی عربوں کے خلاف معاندانہ جذبات رکھتے ہیں کلنٹن کے دورہ شام کے مخالف تھے لیکن کلنٹن نے ان ساری مخالفتوں کے باوجود شام جانے کا فیصلہ کیا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اس مختصر دورے سے کوئی بڑی کامیابی تو حاصل نہ ہوگی لیکن اسرائیل اور شام کے مابین مذاکرات کو دوبارہ زندگی بخشنے میں مدد ملے گی۔

اس سوچ کے ساتھ کلنٹن دمشق پہنچے جہاں صدر حافظ الاسد نے ان کا خیر مقدم کیا لیکن بل کلنٹن کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ مغربی ایشیا کے مسائل بڑے پیچیدہ اور سنگین ہیں دورے کے بعد کلنٹن نے یہ دعوی کیا کہ بات چیت میں پیش رفت ہوئی ہے لیکن بظاہر اس کے کہیں کوئی آثار نظر نہیں آرہے ہیں۔ بل کلنٹن نے یہ دعوی بھی کیا کہ دو طرفہ مذاکرات کے دوران انہوں نے اسد سے یہ وعدہ لیا تھا کہ مشترکہ پریس کانفرنس میں وہ حماس اور اس جیسی دوسری تنظیموں کی "انتہا پسندانہ سرگرمیوں" کی مذمت کریں گے۔ بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اسرائیلی ذمہ داران خاص طور سے اس بات سے پرامید تھے کہ کم ازکم

> **اگر کلنٹن نے یہ امید باندھ رکھی تھی کہ اس دورے سے اسد کے رویے میں لچک آئے گی تو یقیناً انہیں مایوسی ہوئی ہوگی۔ کیوں کہ اسد نے یہ تو تسلیم کیا کہ وہ امن چاہتے ہیں مگر ایسا امن معاہدہ نہیں جیسا کہ اردن اور پی ایل او نے اسرائیل کے ساتھ کیا ہے۔ اسرائیل جب تک گولان کی پہاڑیاں اور جنوبی لبنان کا علاقہ خالی نہیں کرے گا تب تک امن معاہدہ نہیں ہوگا۔**

ایک بار صدر اسد نے پریس کانفرنس میں "مکمل امن کے لئے مکمل انخلاء" کا جملہ استعمال کیا۔ اسرائیلیوں کے نزدیک یہ بات کافی حوصلہ افزا تھی

شام کے صدر حافظ الاسد اس دورے سے یہ فائدہ بھی اٹھانا چاہتے تھے کہ ان کے امریکہ سے تعلقات بہتر ہو جائیں۔ چنانچہ بڑی ہوشیاری سے

کویت کے امیر کویت کا سب سے بڑا ایوارڈ "مبارک الکبیر میڈل" کلنٹن کے گلے میں ڈالتے ہوئے

لیکن دوسرے بہت سارے امریکی اور اسرائیلی ذمہ داران اس دورے سے مایوس ہوئے کیونکہ انہیں اس سے زیادہ کی توقع تھی۔ اسرائیلی وزیراعظم نے اس دورے پر یہ کہکر بھرپور تبصرہ کیا کہ "یہی امن سازی کی بنیاد ہے صبر سے کام لیں"۔

سرگرمیوں" کی مذمت کریں گے۔ مگر صدر اسد نے پریس کانفرنس میں ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔ بلکہ بعد میں انہوں نے یہ تک کہہ دیا کہ دو طرفہ گفتگو میں دہشت گردی سرے سے زیر بحث ہی نہیں آئی۔ ظاہر ہے اسد کے اس بیان نے امریکی ذمہ داروں کے ہوش اڑا دیے چنانچہ دمشق سے واپس ہوتے ہوئے صدر کلنٹن کو پریس رپورٹروں سے بات کرتے ہوئے یہ واضح کرنا پڑا کہ صدر اسد نے تنہائی میں ان سے اس امر پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ تل ابیب میں بس دھماکے میں معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔

بہر حال دونوں رہنماؤں کے درمیان گفتگو کے بیچ جو مسئلہ سب سے زیادہ زیر بحث رہا وہ گولان اور جنوبی لبنان میں مقبوضہ علاقوں سے اسرائیلی فوجوں کی واپسی سے متعلق تھا۔ صدر اسد نے یہ واضح کیا کہ جب تک اسرائیل یہ سارے عرب علاقے پورے طور پر خالی نہیں کر دیتا مکمل امن کا خواب بھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوگا۔ اگر کلنٹن کو یہ امید تھی کہ ان کے دورے سے اسد کے رویے میں کچھ لچک آئے گی تو انہیں ضرور مایوسی ہوئی ہوگی۔ کیونکہ انہوں نے یہ تو تسلیم کیا کہ وہ امن چاہتے ہیں مگر ایسا امن معاہدہ نہیں جیسا کہ اردن اور پی ایل او نے اسرائیل کے ساتھ قائم کر لیا ہے۔

لیکن اس سب کے باوجود کلنٹن نے اپنے دورے کو کامیاب قرار دیا۔ اسرائیلی افسروں نے

انہوں نے واشنگٹن پر اپنے اعتماد کا اظہار کیا اور اصرار کیا کہ دمشق اسرائیل سے مذاکرات امریکہ کے توسط سے کرنا چاہتا ہے۔ جب کہ اس کے برخلاف اسرائیلی براہ راست مذاکرہ چاہتے ہیں لیکن اسکا مطلب یہ نہیں کہ کلنٹن پر انہیں بھروسہ نہیں ہے کیوں کلنٹن کی شکل میں انہیں ایک ایسا امریکی صدر نصیب ہے جو علی الاعلان یہ کہتا ہے کہ "میں اس وقت بھی اور ہمیشہ آپ کے ساتھ کھڑا ہوں گا" امریکی صدر جب دورے سے وطن واپس ہو رہے

> **دمشق میں حافظ الاسد نے کلنٹن کا خیر مقدم کیا۔ وہاں کلنٹن کو بہت جلد احساس ہو گیا کہ مغربی ایشیا کے مسائل بڑے پیچیدہ اور سنگین ہیں۔ دورے کے بعد کلنٹن نے یہ دعوی کیا کہ بات چیت میں پیش رفت ہوئی ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ اسد سے حماس کی سرگرمیوں کی مذمت کرنے کی بھی بات ہوئی ہے۔ مگر اسد نے پریس کانفرنس میں ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔**

تھے تو بے انتہا خوشی کے ساتھ اعلان کیا کہ "مغربی ایشیا کے تنازعے سے متعلق ساری پارٹیاں امریکہ پر بہت ہی زیادہ اعتماد کرتی ہیں" چند ہفتوں بعد ہی امریکی وزیر خارجہ اس خطے کے دورے پر آنے والے ہیں اور بعض مبصرین کو یہ امید ہونے لگی ہے کہ اب کرسٹافر کی بہ نسبت خود کلنٹن اس مسئلے پر زیادہ توجہ دیں گے۔ گویا اس دورے سے کم ازکم یہ نتیجہ نکلا ہے کہ کلنٹن مغربی ایشیا کے امن مذاکرات میں بذات خود بہت زیادہ سرگرمی سے دل چسپی لیں گے۔

یہ کالم ہندوستانی مسلمانوں کے مسائل سے متعلق مسلم و غیر مسلم دانشوروں کے مضامین کے لئے وقف ہے۔ اس میں مختلف مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے دانشوروں کے مضامین شائع کئے جاتے ہیں۔ ان مضامین میں پیش کردہ نقطہ نظر سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں۔ (ایڈیٹر)

تحریر: سید علی

24۔ اکتوبر کو اجودھیا تنازعہ سے متعلق صدارتی ریفرنس کا وہ جواب سپریم کورٹ نے سنا دیا جس کا شدت سے انتظار تھا۔ دفعہ 143 کے تحت عدالت عالیہ سے یہ رائے طلب کی گئی تھی کہ اجودھیا میں بابری مسجد سے پہلے اس جگہ پر کوئی مندر یا ہندو عبادت گاہ تھی یا نہیں؟ سپریم کورٹ کی پانچ رکنی آئینی بنچ نے اتفاق رائے سے فیصلہ سناتے ہوئے کہا کہ اس پر رائے دینا عدالت کی کسر شان ہے اس طرح کے غیر ضروری اور بیکار صدارتی ریفرنس کا جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس طرح وہ انتظامی اور سیاسی مصیبت جس کو سپریم کورٹ کے کاندھے پر ڈال کر مسٹر نرسمہاراؤ بڑے مطمئن تھے کچھ اور نئی مصیبتوں کے ساتھ الٹ کر ان پر نازل ہوگئی ہے۔ صدارتی ریفرنس کو احترام کے ساتھ مسترد کرنے کے علاوہ سپریم کورٹ نے دو اور فیصلے بھی سنائے ہیں ان میں ایک اجودھیا ایکٹ 1993 کے تحت سرکاری تحویل میں لی گئی زمین کے سلسلے میں ہے دوسرا توہین عدالت کے جرم میں سابق وزیر اعلی یوپی کلیان سنگھ کے تعلق سے ہے۔ سرکاری تحویل میں لی گئی زمین کے سلسلے میں آئینی بنچ نے دو کے مقابلے میں تین کی اکثریت سے فیصلہ دیا ہے کہ حکومت اوقاف کی زمین کو اپنی تحویل میں لے سکتی ہے لیکن اس کی حیثیت صرف ریسیور کی ہوگی اور جب تک زیر سماعت مقدمات کا فیصلہ نہ ہو جائے اس وقت تک زمین کے کسی بھی حصہ کو مندر یا مسجد کی تعمیر کے لئے کسی کے حوالے نہیں کر سکتی ہے۔ کلیان سنگھ کو عدالت کے حکم کی خلاف ورزی کے جرم میں ایک دن کی علامتی قید اور دو ہزار روپے جرمانہ کی سزا بھی دیدی گئی ہے۔
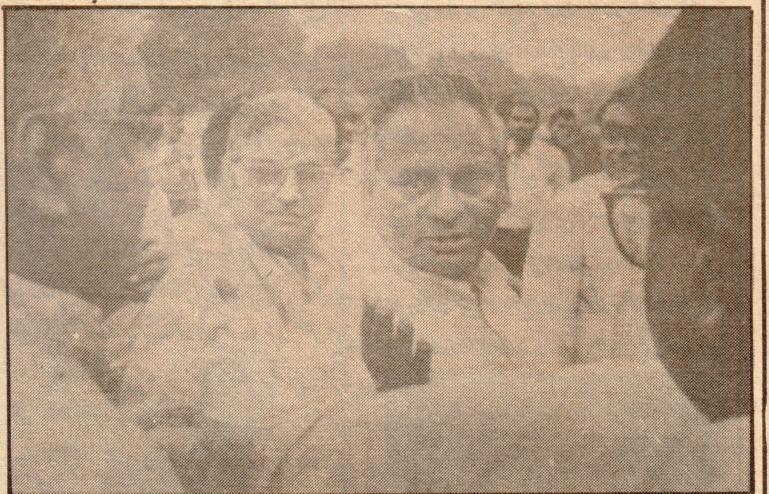
سپریم کورٹ کے ان فیصلوں کا سب سے برا اثر مسٹر نرسمہاراؤ پر پڑیگا۔ جو جواب سننے کے لئے وہ تیار بیٹھے تھے اس کے بجائے خلاف توقع فیصلے سے ان کا سارا منصوبہ ہی الٹ پلٹ ہوگیا۔ انہوں نے خالص سیاسی اور انتظامی مسئلہ میں جس طرح عدالت کو ملوث کرنا چاہا تھا وہ فی نفسہ نہایت ناپسندیدہ اور غیر جمہوری عمل تھا۔ سپریم کورٹ کا کام مقدمات اور تنازعات کا فیصلہ کرنا ہے نہ کہ ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ داں کی طرح تحقیق و تفتیش کا۔ عدالتوں کا اس سے کیا تعلق کہ مسجد کے نیچے کیا تھا، کیسا تھا کس کا تھا؟ مگر نرسمہاراؤ صاحب یہ سارا کھیل ایک خالص مقصد کے تحت کھیل رہے ہیں اس لئے سیاست میں مذہب اور عدالت کو ملوث کرنے میں ان کو کوئی جھجک نہیں محسوس ہوئی۔ عقل والوں نے ان کو بہت سمجھایا کہ جس مسئلہ کا حل وہ تلاش کررہے ہیں اس کے لئے 143 کے بجائے 138(2) کی دفعہ کارگر ہوگی لیکن ان کا ذہن تو کسی اور رخ پر کام کر رہا ہے وہ ایسی عقل کی بات کیوں مان لیتے۔ وہ تو فیصلہ کے بجائے عدالت عالیہ سے رائے طلب کر رہے تھے۔ جس میں حسب خواہش ماننے یا نہ ماننے کی پوری دستوری گنجائش ہے۔ اب وہ سوچیں کہ کس طرح اپنے بچھائے ہوئے جال میں خود پھنس گئے۔ عدالت عالیہ نے اپنے روایتی وقار کو بحال رکھتے ہوئے صدارتی ریفرنس پر غور کرنا کسر شان سمجھا اور اس کو فضول اور بیکار قرار دے کر مسترد کردیا۔ دوسرے فیصلہ کے ذریعہ حکومت کا ہاتھ پاؤں باندھ دیا کہ وہ تحویل میں لی ہوئی زمین کسی کے حوالہ نہیں کرسکتی ہے۔ چرا کارے کند عاقل کہ باز آید پشیمانی۔

وزیر اعظم کے لئے سب سے بڑی پریشان کن بات تو یہ ہوگی کہ اب وہ حکومت کے درپردہ رامالیہ ٹرسٹ کا کیا کرینگے اور سادھو سنتوں اور شنکر آچاریوں کو کیا جواب دینگے۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے کہ ... ہوئے وزیر اعظم مسجد کا نام ہی بھول گئے اور تذکرہ کیا تو اس کا کہ وشو ہندو پریشد کے ہاتھوں سے مندر بنانے کا کام چھین لیا جائے گا (یعنی ہم بنائینگے)۔ پھر انہوں نے سادھو سنتوں اور شنکر اچاریوں کے ساتھ راز و نیاز کا سلسلہ شروع کیا اور بالآخر ایک عدد وشو ہندو پریشد کے مقابلہ میں رامالیہ ٹرسٹ بنوا ڈالا۔ اس کے بعد اعلان کیا کہ حکومت کا کام مندر مسجد اور گردوارہ بنانا نہیں ہے۔ ان ساری باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وزیر اعظم یہ فیصلہ کرچکے ہیں کہ مندر وہ تعمیر کریں گے اور وہیں تعمیر کریں گے جہاں وشو ہندو پریشد بنانا چاہتا ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مندر مسجد تنازعہ میں وزیر اعظم کی حکمت عملی سے کانگریس کو سیاسی فائدہ حاصل ہوا ہے اور فسطائی پارٹیوں کو ایک حد تک سیاسی پسپائی ہوئی ہے۔ مندر کی تعمیر کا کام اپنے ذمہ لے کر انہوں نے بی جے پی کا پرکشش ایشو چھین لیا ہے لیکن جس جانبداری سے وہ ایک مذہبی کام کو ناانصافی کے ساتھ انجام دینا چاہتے ہیں وہ جمہوریت اور سیکولرزم کے ساتھ عملی بے وفائی ہے۔ ان کو جانبداری کا رویہ ترک کردینا چاہئے ورنہ یہ ملک کے لئے بڑی بری مثال ثابت ہوگی۔ سپریم کورٹ کے اس فیصلہ کے بعد ان کی ذمہ داریاں دوچند بڑھ گئی ہیں۔ ایک طرف رامالیہ ٹرسٹ کے شنکر اچاریوں کے غیظ وغضب کا ان کو سامنا کرنا پڑے گا دوسری طرف ممنوعہ وشو ہندو پریشد اور اس کے پریوار کی طرف سے مندر کی تعمیر کا تازہ دم زور توڑنا ہوگا۔ کانگریس کے اندرون خانہ بھی ابال آسکتا ہے۔

> نرسمہاراؤ نے ایک خالص سیاسی اور انتظامی معاملے میں جس طرح سپریم کورٹ کو ملوث کرنا چاہا تھا وہ فی نفسہ نہایت ناپسندیدہ اور غیر جمہوری عمل تھا۔ سپریم کورٹ کا کام مقدمات اور تنازعات کا فیصلہ کرنا ہے نہ کہ ماہرین آثار قدیمہ اور تاریخ دانوں کی طرح تحقیق و تفتیش کا کام کرنا

سپریم کورٹ کے فیصلوں سے اتنی راحت ملی ہے کہ مرکزی حکومت کا فی الحال مندر کی تعمیر میں جوش وخروش ٹھنڈا پڑ جائیگا وہ خود مندر تعمیر کر نہیں سکتی اور نہ ہی کسی کو تعمیر کرنے کی اجازت دے سکتی ہے ... نہیں ہے کہ وزیر اعظم کی ایماء پر رامالیہ ٹرسٹ کی تشکیل ہوئی ہے اور وزیر اعظم نے اپنے خصوصی نمائندوں کے ذریعہ شنکر اچاریوں کو یقین دہانی کرائی ہے کہ متنازعہ زمین (ایودھیا) ان کے حوالہ کردی جائیگی تاکہ وہ وہاں مندر تعمیر کرسکیں۔ نرسمہاراو صاحب کو توقع رہی ہوگی کہ سپریم کورٹ یک نکاتی صدارتی ریفرنس کے تعلق سے رائے لازما ان کی خواہش کے مطابق دیگی پھر وہ آسانی کے ساتھ رامالیہ ٹرسٹ کے توسط سے مندر تعمیر کرالیں گے لیکن ہوا یہ کہ اکوائر کی ہوئی آراضی اب وہ کسی کے حوالہ نہیں کرسکتے جب تک اجودھیا کے سلسلے کے تمام مقدمات کے فیصلے ان کے حق میں نہیں ہوجاتے۔ 48 سے مقدمات کے فیصلے اب تک نہیں ہوسکے اور شاید نصف صدی تک اور فیصلوں کا انتظار کرنا پڑے ایسی صورت میں مسجد۔ مندر خود بخود منجمد ہوجائے گا یا سلگ اٹھے گا اس وقت اصل سوال یہ ہے۔

بابری مسجد کے سلسلے میں وزیر اعظم کا فکری ریکارڈ بڑا خراب رہا ہے۔ پہلے وہ گرج کر کہتے رہے کہ بابری مسجد کی پوری پوری حفاظت کی جائے گی مگر مسجد ڈھائی جاتی رہی اور وہ شام کی چائے نوش فرماتے رہے۔ مسجد منہدم کردیئے جانے کے بعد وہ بولے کہ مسجد اسی جگہ بنائی جائے گی مگر اسی درمیان رام للا کی مورتی مسجد کے اندر لا بٹھائی گئی اور چند دنوں بعد اوپر چھت ڈال دی گئی۔ وزیر داخلہ نے ایک دن یہ اعلان فرمایا کہ وزیر اعظم نے مسجد بنانے کی بات نہیں کی ہے۔ ایک عجوبہ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ کچھ مسلم نمک خواروں نے لہک لہک کر بتایا کہ نرسمہاراو صاحب کو مسجد ٹوٹنے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی وہ بیچارے معصوم ہیں۔ ابھی چند مہینے قبل جولائی میں کانگریس نے دہلی میں ایک منور نجن کا اہتمام کیا تھا تو اس میں تقریر کرتے ... سکتی ہے۔ لیکن اس کا دوسرا پہلو راحت بخش نہیں ہے۔ کلیان سنگھ کا جرم ثابت ہوگیا ہے اور وہ خواہ ایک ہی دن کی سہی سزا پا گئے ہیں اس کے بعد اس کا امکان غالب ہے کہ اس داغی ہیرو کو گلی گلی گھمایا جائیگا اور ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکایا جائیگا۔ اس طرح وشو ہندو پریشد اور بی جے پی مندر کے نیم جاں ایشو کو زندہ کرکے فرقہ وارانہ اشتعال پھیلانے اور سیاسی فائدہ اٹھانے میں سرگرم ہوجائینگی۔ پہلے چار اور پھر چھ اسمبلیوں کے انتخابات ہونے ہیں اس میں بھی وہ مندر کارڈ کھیل سکتے ہیں۔ سپریم کورٹ کا فیصلہ جتنا خوش آئند ہے فسطائی قوتوں کے ہاتھوں امن و امان کے لئے بھی اتنا ہی خطرہ بڑھ گیا ہے۔ مرکزی حکومت کے سر تو اصل ذمہ داری عائد ہوتی ہی ہے ملائم سنگھ کی بھی آزمائش کا اصل وقت آگیا ہے۔ نرسمہاراؤ کی غلط حکمت عملی نے یہ دن دکھایا کہ نہ مسجد تعمیر ہوسکی نہ مندر۔ نہ خدا ہی ملا نہ وصال صنم۔

> کلیان سنگھ کا جرم ثابت ہوگیا ہے وہ سزا بھی پا چکے ہیں، اب اسکا امکان ہے کہ داغی ہیرو کو گلی گلی گھمایا جائے گا۔ اور ہندوؤں کے جذبات کو بھڑکا کر سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی جائے گی۔

سپریم کورٹ (انسیٹ میں) نرسمہاراؤ بلائے مصیبت گلے پڑگئی

کلیان سنگھ کو تو سزا دی گئی مگر دوسروں کو کیوں نہیں؟

بقیہ: زہر افشانیاں

ختم ہو جائے گی وہی اسلام کی زندگی کا آخری دن بھی ہوگا۔ اسلام کا آخری، ابدی اور مثالی پیغام آج بھی اہم ہے اور کل بھی رہے گا۔ بیسویں صدی کے موڑ پر بھی وہ اتنا ہی شاداب، برمحل اور بامعنی ہے جتنا کہ چودہ سو سال پہلے تھا۔

آخر میں ہم رشید طالب صاحب کو قدرے بے تکلفانہ اور دوستانہ مشورہ یہ دینا چاہیں گے کہ آپ نے اپنا جو نام رکھا ہے وہ "بیرون ملک" سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لئے اس نام سے آپ ضرور چھٹکارہ پا لیں تاکہ کم از کم اسلام کے پنجے سے خود کو محفوظ کر لیں۔ ہمارے نزدیک آپ کی مثال اس بوڑھی لومڑی کی ہے جو کسی حادثے میں اپنی دم گنوا بیٹھی تو اپنے پورے قبیلے کو یہ باور کرانے پر تل گئی کہ خوبصورت نظر آنے کے لئے وہ بھی اپنی دمیں کٹا دیں۔ ہمیں آپ کی نظر میں خوبصورت بننے کے مقابلے میں اپنی دمیں برقرار رکھنا زیادہ عزیز ہے۔

اسلام کی بقاء کے لئے تبدیلی اہم اور ضروری نہیں ہے۔ البتہ معروف قومی اور بین الاقوامی حلقوں میں رشید طالب اور ان کے ہم ذہنوں کو نمایاں رکھنے کے لئے اس قسم کا شور و غل ضروری ہے تاکہ وہ ان آنکھوں کو نظر آسکیں جو ہمہ وقت ایسے لوگوں کی تلاش میں ہیں جو اسلام کی جڑیں اندر ہی اندر سے کھوکھلی کرسکیں۔

(انگریزی سے ترجمہ)

"سپریم کورٹ کا فیصلہ ہمیں قبول نہیں" ملی پارلیمنٹ

بابری مسجد سے متعلق سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے سیاسی وصحافتی حلقوں میں جو ہلچل مچی تھی وہ ابھی قائم ہے اور ہندو لیڈروں کے ساتھ ساتھ مسلم قائدین کی جانب سے بھی اس پر اپنے رد عمل کا اظہار کیا جارہا ہے۔ یہ اظہار یوں ہے کہ حالیہ فیصلہ تاریخی نوعیت کا ہے اور یہ کہ عدالت عظمٰی نے انتہائی غیر جانبدارانہ موقف اختیار کیا ہے جو مسلمانوں کے لئے خوش آئند ہے۔ اس فیصلے کو اس لئے بھی بہت زیادہ اہمیت حاصل ہوگئی ہے کہ اس کے نتیجے میں بابری مسجد سے متعلق تمام مقدمات از سر نو زندہ ہوگئے ہیں۔ اور سپریم کورٹ نے ملکیت کے مقدمے پر بھی شنوائی کا حکم دیدیا ہے۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ فیصلہ تین حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا صدارتی ریفرنس کو غیر ضروری اور بیکار کہ کر واپس کردینا۔ دوسرا اجودھیا ایکویزیشن ایکٹ کو جائز قرار دینا اور تیسرا کلیان سنگھ کو علامتی سزا سنانا۔

آل انڈیا مسلم پرسنل لاء بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی اور دوسرے مسلم قائدین کی جانب سے بھی اس فیصلے کی ستائش کی گئی ہے اور سپریم کورٹ کے "غیر جانبدارانہ" رول کی تعریف کی گئی ہے۔ پرسنل لاء بورڈ کی بابری مسجد کمیٹی کی جانب سے حکومت سے یہ اپیل بھی کی گئی ہے کہ وہ بابری مسجد سے متعلق تمام معاملات کو تیزی سے نمٹانے کا حکم دے، دوسری مسلم تنظیموں کی جانب سے بھی حالیہ فیصلے کی مدح سرائی کی گئی ہے لیکن اس سلسلے میں ملی پارلیمنٹ کا موقف تمام مسلم تنظیموں اور مسلم قائدین کے موقف سے الگ ہے۔ ملی پارلیمنٹ کے مطابق جو لوگ اس فیصلے کو غیر جانبدارانہ قرار دے رہے ہیں وہ طفلانہ قیاس آرائی سے کام لے رہے ہیں۔ اس فیصلے کی تعریف کرنے والے مسلم قائدین ملی پارلیمنٹ کی نظر میں یا تو انتہائی احمق ہیں یا وزیر اعظم کے زر خرید غلام۔

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے پر اپنے موقف کا اظہار کرنے کے لئے گذشتہ دنوں ملی پارلیمنٹ نے دہلی کے پریس کلب آف انڈیا میں ایک پریس کانفرنس کی تھی جسے ملی پارلیمنٹ کے قائد جناب راشد شاذ نے خطاب کیا تھا۔ اس موقع پر پریس ریلیز بھی جاری کی گئی۔ پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے نے ملی پارلیمنٹ کو ایک صدمے سے دو چار کر دیا ہے۔ اس لئے کہ اس فیصلے سے اب یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ سپریم کورٹ کو بھی مسلمانوں کے مذہبی مقامات کے تحفظ سے کوئی دلچسپی نہیں رہ گئی ہے۔ یہ یقین کرنا کہ سپریم کورٹ نے اس مسئلے پر غیر جانبدارانہ موقف اپنایا ہے دراصل طفلانہ قیاس آرائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ رہے وہ مسلم قائدین جو اس فیصلے کی مدح کرتے نہیں تھکتے وہ یا تو انتہائی احمق ہیں یا مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ یا پھر نرسمہا راؤ کے زر خرید ایجنٹ ہیں جن کا کام مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے۔ اس فیصلے نے واضح کردیا ہے کہ ایودھیا کی زمین سے متعلق ایکٹ یا تو ایک خاص مذہبی فرقہ کو نقصان پہنچاتا ہے یا دوسرے کو فائدہ اس لئے اس ریفرنس کا مقصد سیکولرزم کے منافی اور غیر آئینی ہے۔ (فیصلہ۔ پیراگراف 154) فیصلے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عدالت نے غیر جانبدارانہ رویہ اپنایا ہے اور خود کو اس سے الگ تھلگ رکھا ہے لیکن سچائی صرف اتنی ہے کہ عدالت کو یہ فیصلہ دینا تھا کہ بابری مسجد کی جگہ پر کسی ہندو مندر کا وجود تھا یا نہیں؟ اور جیسا کہ دنیا جانتی ہے کہ کسی بھی قانونی اور تاریخی تحقیق کے نتیجے میں اس سوال کا جواب نفی ہی میں ہوسکتا ہے۔ اور شاید اسی لئے عدالت نے اپنے آپ کو اس سے الگ تھلگ کرلیا۔ کیونکہ اگر کوئی بھی فیصلہ مسلم اقلیت کے حق میں جاتا ہے تو اس پر عمل در آمد نہیں کیا جاسکے گا۔ فیصلے میں آگے یوں ہے "اگر اس معاملے میں عدالت یہ کہہ دے کہ کوئی ہندو مندر یا ہندو عبادتگاہ متنازعہ مقام پر نہیں تھی تب بھی یہ بات یقینی نہیں ہے کہ مسجد دوبارہ بنادی جائے گی" (فیصلہ پیراگراف 155) یعنی عدالت کو اس کا احساس ہے کہ وزیر اعظم کی بار بار کی یقین دہانی کے باوجود کہ بابری مسجد کی دوبارہ تعمیر ناممکن ہے۔ باالفاظ دگر دراصل عدالت نے یہ کہا ہے کہ چونکہ مسلمان کمزور ہیں اس لئے ان کی مسجد انہیں دوبارہ واپس نہیں دلائی جاسکتی۔ فیصلے کا یہ انداز بہت ہی سنگین ہے اور اس سے ایک سیکولر اور جمہوری ملک کے مستقبل پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے۔

> یہ یقین کرنا کہ سپریم کورٹ نے غیر جانبدارانہ موقف اپنایا ہے طفلانہ قیاس آرائی کے سوا کچھ نہیں ہے، وہ مسلم قائدین جو اس فیصلے کی مدح کرتے نہیں تھکتے یا تو احمق ہیں یا ان میں مسائل کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں ہے یا پھر وہ حکومت کے زر خرید ایجنٹ ہیں جن کا کام امت مسلمہ کی آنکھوں میں دھول جھونکنا ہے

پریس کانفرنس کا ایک منظر

کلیان سنگھ کو علامتی سزا دینے کے بارے میں پریس ریلیز میں کہا گیا ہے کہ یہاں لینے اور دینے کی بات الگ الگ ہے۔ اگر کوئی ہندو فاشسٹ نیتا قانون کی خلاف ورزی کرے تو اس کے لئے ایک دن کی سزا ہے لیکن مسلمان اگر اپنے غم وغصے کا اظہار کرے تو اس کا مقدر طویل المدتی قید وبند، حکومتی تشدد اور ٹاڈا ہے۔ پھر یہ سوال بھی انتہائی اہم ہے کہ کلیان سنگھ ہی کیوں؟ یہ سچ ہے کہ مسجد ان کے دور میں منہدم ہوئی لیکن غیر قانونی وغیر آئینی مندر کی تشکیل تو مرکز کی نگرانی میں ہوئی پھر قانون کی خلاف ورزی کرنے والے دوسروں کو سزا کیوں نہیں؟

سپریم کورٹ کے حالیہ فیصلے سے پیدا شدہ صورتحال کا جائزہ لینے اور دوسرے ملی معاملات پر غور وخوض کرنے کے لئے ملی پارلیمنٹ کی جانب سے علیگڑھ میں 13 سے 19 تک ایک ہفتے کا ایک خصوصی اجلاس بھی منعقد کیا جارہا ہے۔ جس میں ملک بھر سے ملی پارلیمنٹ کے اعلیٰ عہدیداران شرکت کر رہے ہیں جو درحقیقت مابعد انہدام ہندوستان میں مسلمانوں کے تحفظ کے لئے نئی حکمت عملی پر غور کریں گے۔ ضرورت محسوس ہوئی تو ملی پارلیمنٹ بابری مسجد کے مسئلے پر ایک خصوصی کمیٹی بھی تشکیل دیگی۔ اس موقع پر مختلف پارلیمانی کمیٹیاں بھی اپنے الگ الگ اجلاس کر رہی ہیں۔

ملی پارلیمنٹ کی پریس ریلیز کے مطابق چونکہ مسلمانوں کی تمام توقعات حکومت اور عدالت پر سے اٹھ چکی ہیں اس لئے اب ان کے لئے صرف ایک راہ ہے وہ ہے بین الاقوامی فورم پر اس مسئلے کا اٹھایا جانا۔ کیونکہ بابری مسجد کا انہدام اور اس جگہ پر رام مندر کی تعمیر ایک غیر دستوری عمل ہے اور رام للا کا ہر درشن آئین کا مذاق ہے۔ ملی پارلیمنٹ نے اس معاملے کو او آئی سی (تنظیم اسلامی کانفرنس) اور بین الاقوامی انسانی حقوق کمیشن میں بھی اٹھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ ملی پارلیمنٹ نے او آئی سی کی رکنیت کی درخواست دی ہے جس پر او آئی سی کے مرکزی ہیڈ کوارٹر میں سنجیدگی سے غور ہورہا ہے۔

اس موقع پر سیاسی معاملات کی کمیٹی، اقتصادی معاملات کی کمیٹی انسانی حقوق کمیٹی اور دعوہ کمیٹی بھی اپنے اجلاس کر رہی ہیں جو دراصل مسلمانوں کے لئے سیاسی اسٹریٹجی، "سینٹرل بینک آف مسلم انڈیئز" کے قیام، مسلمانوں پر ہو رہی زیادتیوں اور ہندوؤں ومسلمانوں کے درمیان نفرت کی خلیج کو ختم کرنے جیسے معاملات پر غور کررہی ہیں۔

اس اجلاس میں اس پر خاص طور سے غور کیا جائے گا کہ بابری مسجد کے بارے میں اب کیا لائحہ عمل اختیار کیا جائے۔

بقیہ: حماس کو ختم کرنے کا عرفات کو حکم مگر....

حماس 1987 کی تحریک انتفاضہ کے دوران معرض وجود میں آئی۔ یہ شیخ احمد یاسین کی اس سماجی تنظیم کا ایک حصہ ہے جو برسوں سے غازہ پٹی میں سرگرم عمل ہے۔ یہ تنظیم، اسکول، ہاسپٹل، اسپورٹنگ کلب اور اسی نوعیت کے دوسرے سماجی ادارے چلاتی تھی۔ مگر تحریک انتفاضہ کے دوران اس نے مسلح جدوجہد کا پروگرام بنایا خصوصا 1989 میں حماس نے اسرائیل کے خلاف کئی کامیاب مسلح حملے کئے جس کے بعد شیخ احمد یاسین کو جیل میں بند کردیا گیا۔

بظاہر ایک معذور بزرگ مگر جوان عزم رہنما کی گرفتاری کے بعد حماس کی قیادت نوجوان اور زیادہ سرگرم لوگوں کے ہاتھ میں آگئی۔ ان لوگوں نے اب کھل کر اسرائیل کے خلاف حملے شروع کردیئے۔ اسی کے ساتھ ان لوگوں نے ان فلسطینیوں کو بھی ٹھکانے لگانا شروع کردیا جو اسرائیل کے لئے جاسوسی کر رہے تھے۔ شیخ یاسین کی گرفتاری کے بعد حماس کے وہ کارکن جو سماجی تنظیموں اور اسپورٹ کلبوں میں سرگرم تھے اس کی فوجی ونگ میں شامل ہوگئے۔ حماس کے کارکن بالعموم بہت پڑھے لکھے اور سماجی حیثیت کے حامل ہیں۔

1990 میں اور اس کے بعد حماس کو اردن کی اخوان المسلمین اور افغان جہاد میں شرکت کرنے والے غازیوں کے ذریعہ تربیت ملنے لگی۔ سعودی عرب اور دوسرے خلیجی ممالک کے علاوہ امریکہ ویوروپ میں رہنے والے ہمدردوں سے بھی حماس کو مالی مدد ملنے لگی۔ فوجی تربیت اور مالی مدد نے حماس کو ایک زبردست تنظیم بنادیا۔ اسرائیل کے خفیہ ایجنٹ لاکھ کوشش کے باوجود اس تنظیم میں گھس پیٹھی کرنے سے ناکام رہے ہیں۔ غازہ پٹی کی بار بار کی ناکہ بندی اور 1992 میں 400 حماس کارکنوں کو جنوبی لبنان کے ایک انتہائی سرد علاقے میں جلاوطن کردینے جیسے غیر انسانی اقدامات بھی حماس کو ختم کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

حماس کی فوجی ونگ میں صرف چند سو افراد ہیں جو مختلف چھوٹی چھوٹی خود مختار ٹکڑیوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ اس کے فوجی کارکن جذبہ شہادت سے سرشار ہیں۔ یہ لوگ ایک دوسرے سے بہت زیادہ مربوط اور بہت خفیہ انداز میں کام کرتے ہیں جس کی وجہ سے اسرائیلی ایجنٹ ان کا پتہ لگا کر ان کا خاتمہ کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ وسط اکتوبر میں تل ابیب بس دھماکے کے ذمہ دار حماس کارکن 28 سالہ یحیٰ عیاش کی زندگی اس تنظیم کے خد وخال پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ ایک انجینئر ہے اور پچھلے دو سالوں سے اسرائیلی جاسوسوں کو چکمہ دیکر فوجی کارروائیوں میں مصروف ہے اسرائیلی ایجنٹ اور فوج لاکھ کوشش کے باوجود اسے گرفتار نہیں کرسکے۔

حماس کے فوجی کارکن کافی پڑھے لکھے اور تربیت یافتہ ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ کس طرح خود کو اسرائیلی ایجنٹوں سے محفوظ رکھا جائے، اکثر وہ مذہبی یہودیوں کا لباس پہن کر کار چلاتے ہوئے اسرائیل کے اندر دندناتے پھرتے ہیں ان کی کاروں پر دائیں بازو کے یہودیوں کا یہ نعرہ بھی لکھا ہوتا ہے کہ "خود کو مسیح کے لئے تیار کرو"۔ بھیس بدلنے کے ماہر ہونے کے علاوہ حماس کے فوجی کارکن یہ بھی جانتے ہیں کہ کس طرح اسرائیل کے خلاف جاسوسی کی جائے، وہ خصوصی طور سے اسرائیلی فوج اور دوسرے شہری ٹھکانوں کے بارے میں جاسوسیاں کرتے ہیں تاکہ وقت پڑنے پر ان کے خلاف کارروائی کرسکیں۔

ایک عام اندازے کے مطابق حماس کو غازہ پٹی کے تقریبا پچاس فیصد لوگوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس طرح سیاسی سطح پر بھی حماس کافی مضبوط ہے مگر دراصل یہ اس کے فوجی کارکن ہیں جن کے سرفروشانہ حملوں نے فلسطینی نوجوانوں کے دل جیت لئے ہیں۔ جب حماس کے ایک جانباز نے تل ابیب میں پسنجر بس پر حملہ کیا اور جام شہادت نوش کرتے ہوئے 23 یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تو وہ راتوں رات فلسطینی نوجوانوں کے لئے ایک مثالی کردار بن گئے۔ حماس اور اس کے فوجی کارکنوں کی مقبولیت سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اگر عرفات نے رابن اور کلنٹن کے کہنے پر ان کے خلاف کارروائی کی تو انہیں کن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے گا۔

مسلمانوں کے لئے ریزرویشن
غاصبوں سے حق وانصاف کا مطالبہ؟

سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ ان دنوں پورے ملک میں موضوع بحث بنا ہوا ہے۔ اس مسئلے پر سیاسی پارٹیوں سے لے کر مسلم تنظیموں اور ریاستی حکومت ومرکزی وزراء سے لے کر غیر مسلم ومسلم دانشوروں کے درمیان چہ میگوئیوں کا بازار گرم ہے۔ بعض سیاسی پارٹیاں اسے خالصتاً ووٹ کے حصول کے لئے ایک گرما گرم ایشو تصور کر رہی ہیں تو بعض اسے محض مسلم پرستی کا شاخسانہ بتا رہی ہیں۔ دوسری جانب بعض مسلم تنظیمیں اور ان کے رہنما بابری مسجد کے شہادت کے بعد اپنی کھوئی وقعت اور عوامی بنیاد کی بازیافت کے لئے اس مسئلے کو نسخہ گردان رہے ہیں۔ جن ریاستوں میں اس وقت انتخابات کی دھوم دھام ہے اور جہاں آنے والے دو تین مہینے کے اندر انتخابات ہونے والے ہیں وہاں مسلم ووٹ کی اہمیت کے پیش نظر مسلمانوں کو ریزرویشن کے سبز باغ دکھانے میں وہاں کی حکومتیں اور سیاسی پارٹیاں ایک دوسرے پر سبقت حاصل کرنے میں مگن ہیں۔ بعض مرکزی وزراء کی جانب سے بھی مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی پس ماندگی پر اچانک اظہار ہمدردی اور ریزرویشن کی وکالت اس بات کا کھلا اعلامیہ ہے کہ مسلمانوں کی فلاح وترقی سے زیادہ ان کے ووٹ کا سودا ان کی نظر میں زیادہ اہم ہے اور جس کی بندر بانٹ میں یہ تمام جماعتیں، تنظیمیں، دانشوران، حکومتیں اور رہنما بلا تخصیص خویش وبیگانہ سب مصروف ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مسلمانوں کی تعلیمی ومعاشی پس ماندگی کے تدارک کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ بار آور ثابت ہوگا؟ یا یہ بات بھی اسی نوع کا شاخسانہ بن کر رہ جائے گا جو مسلمانوں کو الجھانے کے لئے یہاں کی حکومتیں اور سیاسی جماعتیں گذشتہ نصف صدی سے اختیار کئے ہوئی ہیں؟ اور جن کا شکار ہوکر ہندوستانی مسلمان روز بروز ذلت ورسوائی اور پس ماندگی وزوال سے ہمکنار ہوتے جارہے ہیں۔ اس اندیشے کو تقویت بہم پہنچانے والے درج ذیل پہلو قابل غور ہیں۔

اول یہ کہ ملک کا موجودہ نام نہاد سیکولر اور جمہوری نظام جس نے یوں تو بظاہر آئینی طور پر اپنے تمام شہریوں کو یکساں حقوق عطا کر رکھے ہیں اور ملازمت ہو یا تعلیم کسی بھی سطح پر کسی قسم کے امتیاز کی جس میں کوئی گنجائش نہیں۔ لیکن اس کے باوجود یہ حقیقت بالکل عیاں ہے کہ گذشتہ نصف صدی میں ملک نے جو بھی ترقی کی ہے اس کا سارا ثمرہ صرف ایک مخصوص فرقے کی مخصوص ذاتوں کو ملا۔ اور خواہ وہ نجی سیکٹرز ہوں یا عوامی سیکٹرز سرکاری ملازمتوں اور عہدوں پر تقرری کا معاملہ ہو یا تعلیم اور ٹکنالوجی کے میدان میں سبقت حاصل کرنے کا معاملہ ہر شعبے پر انہیں مخصوص فرقے اور ذاتوں کے افراد کی اجارہ داری قائم رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ ہمارے نام نہاد سیکولر اور جمہوری نظام کے تحت ہی ہوتا رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ خود ہندو فرقے کی اعلیٰ ذات جس کی اجارہ داری تمام شعبے پر قائم ہے اور جس کے اندر ذات پرستی اور تعصب کا مادہ اس قدر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے کہ خود اپنے ہی فرقے کی پس ماندہ اور پچھڑی ذاتوں کا استحصال صدیوں سے کرتی آئی ہیں اور اب جب کہ پس ماندہ ذات کی جانب سے اس استحصال کے خلاف آوازیں بلند ہورہی ہیں اور وہ اپنا حق لینے پر آمادہ ہیں تو اعلیٰ ذات کی جانب سے جس قسم کا معاندانہ رویہ اختیار کیا جارہا ہے۔ وہ بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ وشو ناتھ پرتاپ سنگھ کی حکومت نے جب منڈل کمیشن کے نفاذ کا اعادہ کیا تو بھارتیہ جنتا پارٹی اور کانگریس آئی جو کہ بنیادی طور پر اعلیٰ ذات کی نمائندگی کرنے والی سیاسی پارٹیاں ہیں ان کی جانب سے پورے ملک میں جس شورش اور خلفشار کو ہوا دیا گیا اور جس طرح بالآخر وی۔ پی سنگھ کی حکومت کا جنازہ نکال کر ہی ان پارٹیوں نے چین کی سانس لی اس سے بھی ان برہمنی نظام کے ٹھیکے داروں کے عزائم کا اندازہ بخوبی ہوجاتا ہے۔

کیا مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے تدارک کے لئے ریزرویشن کا مطالبہ بار آور ثابت ہوگا؟ یا یہ مسئلہ بھی اسی نوع کا شاخسانہ بن کر رہ جائے گا جو مسلمانوں کو الجھانے کے لئے یہاں کی حکومتیں اور سیاسی جماعتیں گذشتہ نصف صدی سے اختیار کئے ہوئی ہیں؟ اور جن کا شکار ہوکر ہندوستانی مسلمان روز بروز ذلت ورسوائی اور پس ماندگی وزوال سے ہمکنار ہوتے جارہے ہیں۔

علاوہ بریں آج بھی بہار اور اترپردیش میں پس ماندہ ذاتوں کی نمائندگی کرنے والی حکومتوں کے خلاف جس قسم کی محاذ آرائی اعلیٰ ذاتوں اور ان کی نمائندہ پارٹیوں کی جانب سے جاری ہے وہ بھی اس بات کا اشاریہ ہے کہ یہ نظام اور یہاں کا آئین چاہے جمہوریت اور سیکولرزم کی جتنی بھی دہائی دے لیکن اس نظام کی اصل زمام ہندو فرقے کی اعلیٰ ذات کے ہی ہاتھ میں ہے اور وہ کسی بھی قیمت پر اس ملک کے نظام پر اپنی اجارہ داری کے سلسلے میں مجھوتہ کرنے پر آمادہ نہیں۔

اب رہی بات مسلمانوں کی تو آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کو جس قسم کے مسائل کا سامنا ہے وہ کسی اور کے پیدا کردہ نہیں بلکہ خود اسی نظام کی پیداوار ہیں۔ جسے ہم نام نہاد سیکولر اور جموری نظام تصور کرتے ہیں۔ ایک طرف اگر فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعے سرکاری مشینری اور مسلم مخالف سماج دشمن عناصر کی ملی بھگت سے مسلمانوں کی معیشت کو تباہ وبرباد کرنے کی سازشیں ہوتی رہی ہیں تو دوسری جانب سرکاری وغیر سرکاری محکموں اور تعلیمی وتکنیکی اداروں میں مسلمانوں کے ساتھ تعصبانہ رویہ اختیار کرتے ہوئے ان کے داخلے اور تقرری پر غیر تحریری پابندی عائد کرنے کی بھی سازشیں کی جاتی رہی ہیں جس کے نتیجے میں مسلمانوں کے اندر احساس شکست خوردگی اور محرومی بڑھتا گیا اور رفتہ رفتہ سرکاری ملازمتوں کے ساتھ ساتھ معاشی اور تعلیمی شعبے میں مسلمانوں کے اندر مسابقانہ رجحان ختم ہوتا چلاگیا۔

لہذا یہ سب اچانک نہیں ہوا کہ سرکاری ملازمتوں میں ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی آج بعض شعبے میں دو فی صد سے بھی کم ہے تو بعض میں ایک فیصد سے بھی کم جب کہ بعض محکمے میں تو سرے سے مسلم نمائندگی کا وجود ہی نہیں ہے۔ اسی طرح اگر انڈسٹری اور تجارت کے میدان میں مسلمانوں کے وجود کی تلاش کی جائے تو شاید خورد بین بھی مثبت نتیجہ نہ دے سکے۔ حتی کہ پارلیامنٹ اور ریاستی قانون ساز اسمبلیوں میں بھی مسلمانوں کی نمائندگی کی شرح حد درجہ مایوس کن ہے۔ اس سلسلے میں صرف ایک ریاست کی مثال عبرت کے لئے کافی ہوگی اور وہ ریاست ہے مدھیہ پردیش، جہاں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب قابل لحاظ ہے جب کہ وہاں کی موجودہ منتخبہ قانون ساز اسمبلی میں ایک بھی مسلم ممبر نہیں ہے۔ آخر وہاں مسلم نمائندگی کی ایسی عبرت انگیز صورت حال کیوں؟ جب کہ یہ ملک تو سیکولر اور جمہوری ہے، اور اس حیثیت سے پارلیامنٹ سے لے کر ریاستی قانون ساز اسمبلیوں اور سرکاری وغیر سرکاری اداروں میں ملک کے ہر طبقے اور فرقے کی نمائندگی لازمی ہے۔ لیکن یہ سیکولرزم اور جمہوریت ہندوستانی مسلمانوں کو ان کا حق دلانے میں کارگر کیوں نہیں ہے؟ کچھ نہیں تو کم از کم مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب میں تو نمائندگی عطا کرنا اس نظام کی ذمہ داری تھی۔ لیکن اس نظام نے اپنی ذمہ داریوں کو پورا نہیں کیا؟ آخر کون سی ایسی رکاوٹ رہی ہے جس کے سبب ہندوستانی مسلمان اپنے ہی ملک میں ان جمہوری حقوق سے محروم کر دئے گئے ہیں جس پر تمام شہریوں کا یکساں تصرف ہونا لازمی ہے؟

ہندوستانی مسلمانوں کے جمہوری حقوق سے متعلق یہ سوالات غور طلب ہیں۔ کیونکہ گذشتہ نصف صدی سے اس ملک میں مسلمانوں کو جس طرح سیکولرزم اور جمہوریت کے نام پر دھوکا دیا جاتا رہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج نہ صرف ان کی تعلیمی، معاشی اور سماجی حیثیت تقریباً صفر کے قریب پہنچ چکی ہے بلکہ ان کی مذہبی وتہذیبی تشخص اور آزادی بھی خطرے میں ہے۔ بابری مسجد کی شہادت اس کی ایک عبرت انگیز مثال ہے۔ جب کہ ہندوستانی مسلمان سیکولرزم اور جمہوریت کے اصولوں پر کاربند ہوکر آزادی کے بعد اس ملک میں اپنی الگ سیاسی پارٹی کے قیام کی بجائے مختلف قومی پارٹیوں میں شریک ہوکر ان کا حصہ بنے رہے۔ اور اس سے قبل کبھی انہوں نے اپنی الگ نمائندگی خواہ وہ سیاسی اداروں کی سطح پر یا سرکاری ملازمتوں کی سطح پر ہو نہیں کی تھی۔ لیکن ہندوستانی مسلمانوں کے اس روشن خیالی اور وسیع النظری کا انہیں جو صلہ ملا وہ نگاہوں کے سامنے ہے۔

لہذا یہ ضروری ہے کہ مسلمان ان مسائل پر سنجیدگی سے غور کریں۔ اور اپنے مسائل کے حل کے لئے متحدہ لائحہ عمل اختیار کریں۔ اور اس کے لئے لازمی ہے کہ سیاسی سطح پر اپنی قوت کو مجتمع کرنے کی سعی کریں۔ کیونکہ آج سیاسی اقتدار اور سیاسی قوت کے اظہار کے بغیر ان کے کسی مطالبے کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی۔ آج جو بیداری کی لہر اور اپنے حقوق کے لئے جس شعور کا اظہار پس ماندہ ذاتوں کی جانب سے ہورہا ہے۔ اس کے پیچھے ان کا وہ سیاسی اتحاد اور وہ سیاسی قوت ہی ہے جس سے اعلیٰ ذات کے ہندو طبقات خائف ہیں۔ مسلمانوں کے لئے بھی لازمی ہے کہ وہ اپنے جمہوری حقوق کے حصول اور ہر سطح پر متناسب نمائندگی کے لئے متحدہ حکمت عملی وضع کرنے کی کوشش کریں۔

گذشتہ نصف صدی سے اس ملک میں مسلمانوں کو جس طرح سیکولرزم اور جمہوریت کے نام پر دھوکا دیا جاتا رہا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ آج ان کی تعلیمی معاشی اور سماجی حیثیت تقریباً صفر کے قریب پہنچ گئی ہے۔

اس بات کا بھی امکان ہے کہ مسلم مخالف قوتوں کی جانب سے مسلمانوں کی صفوں میں انتشار برپا کرنے کی کوششیں کی جائیں گی۔ اور مسلمانوں میں بھی ذات پات کی بنیاد پر تفریق پیدا کرکے نمائندگی کے سوال کو متنازعہ اور ناقابل قبول بنانے کی کوششیں ہوں گی۔ لہذا ایسی تخریبی کوششوں پر سخت نگاہ رکھنی بھی ضروری ہے۔ کیونکہ ایک غاصب نظام اور اس نظام کے ٹھیکے دار جن کی پوری پالیسی تعصب اور امتیاز پر مبنی ہے بھلا یہ کیوں کر گوارہ کرسکیں گے کہ اس ملک میں ہر فرقے اور طبقے کو ان کا جائز حق مل سکے۔ بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ انہوں نے جس قسم کا رویہ اختیار کر رکھا ہے اس کے پیش نظر سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں نمائندگی کا مطالبہ ہو یا پارلیامنٹ اور قانون ساز ریاستی اسمبلیوں میں ان کی متناسب نمائندگی کا سوال بے حد محتاط اور دور رس حکمت عملی اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔ ایک ایسی حکمت عملی جو ووٹ کی سیاست اور مسلم رہنماؤں کی ذاتی منفعت کی قربان گاہ پر ملی مفاد کو قربان کرنے کی بجائے خلوص اور نیک نیتی پر مبنی ہو اور جو ملی وسیاسی اتحاد کے قیام کے ساتھ ساتھ مسلم دشمن عناصر کی سازشوں کا بھی جواب رکھتی ہو۔ ●●

اس پسماندگی کا ذمہ دار کون؟ کیا اس کا حل ریزرویشن ہے؟

امریکہ اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں

سپریم کورٹ فرضی استفسار کا جواب نہیں دیتی

اجودھیا کے معاملے میں کسی مندر کے وجود کے سوال پر صدارتی استصواب کی عبارت بذات خود متنازعہ تھی

انیرودھ بوس کی تحریر

مسئلہ ایودھیا سے متعلق صدارتی استصواب پر کوئی رائے صادر نہ کرکے سپریم کورٹ نے ملک کے ماہرین کے درمیان ایک بار پھر یہ تنازعہ کھڑا کر دیا ہے کہ ایک ایسے دستور میں جو عدالت عظمی کو انتظامیہ کے مشیر کی حیثیت دیتا ہے اس طرح کی گنجائش رکھنے کا کیا جواز ہے۔

دفعہ 143 (الف) کی رو سے صدر کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ایسے قانون اور حقائق کے بارے میں جن کی نوعیت اور اہمیت اتنی ہو کہ ان پر سپریم کورٹ کی رائے لینا ناگزیر قرار پائے سپریم کورٹ سے رجوع کرکے اس کی رائے معلوم کرسکتا ہے۔

یہ دفعہ ایک عجیب قانونی ترکیب پر مشتمل ہے جو کسی عدالتی ادارے سے یہ تقاضا کرتی ہے کہ وہ لوگوں کی زندگی، آزادی اور املاک سے متعلق موجودہ تنازعات کو فیصل کرنے کے روایتی کردار سے انحراف کرکے اس کے بجائے عموماً ایسے فرضی سوالات کے جواب دینے میں لگ جائے اور یہ سوال اس کے سامنے ایسے اقتدار اعلی کی طرف سے رکھے جائیں جو تنازعہ میں ایک فریق کا درجہ بھی کسی طرح نہیں رکھتا۔ مزید یہ کہ یہی دفعہ سپریم کورٹ کو امتیازی اختیارات بھی دیتی ہے کہ وہ اس طرح کے استصواب کو زیر غور لائے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ کسی سوال کا جواب دینے سے انکار بھی کر سکتی ہے جیسا کہ اس نے ایودھیا کے معاملے میں کیا ہے۔ اس کے علاوہ یہ کہ معاملے میں دلچسپی رکھنے والے فریقوں کو عدالت میں حاضر ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگرچہ سپریم کورٹ عموماً تمام خواہش مند فریقوں سے سماعت کے لئے درخواستیں قبول کرتی ہے۔

دفعہ 143 کا دوسرا حصہ جو حکومت ہند اور قدیم

> اجودھیا کے معاملے میں صدارتی استفسار کی عبارت متنازعہ تھی۔ یہ بات بھی غیر واضح تھی کہ سپریم کورٹ کے اخذ کردہ نتیجے سے کون سا مقصد حاصل ہونے والا ہے۔ غالباً اپنے رول کی ادائیگی کے اسی سوال نے عدالت عظمی کو استصواب کا جواب نہ دینے پر مجبور کیا۔

ریاستوں کے مابین ماقبل دستوری معاہدوں سے متعلق سپریم کورٹ کی طرف رجوع کیے گئے سوالوں کا جواب دینا اس کے لئے لازمی قرار دیتا ہے وہ چھبیسویں ترجیحی بل کے ذریعے "رایل پریویلج" کے خاتمے کے ساتھ عملاً بے ثمر ثابت ہوتا ہے۔

دفعہ 143 کی بنیاد در اصل حکومت ہند کے ایکٹ 213 مجریہ 1935 پر ہے جو ہمارے دستور کا پہلا تشکیلی ماڈل یا نمونہ ہے۔ اس ایکٹ کے مطابق گورنر جنرل کو عبوری اہمیت کے قانونی مسائل کو سپریم کورٹ کی پیش رو وفاقی عدالت یا فیڈرل کورٹ سے رجوع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔ تاہم سپریم کورٹ کے مشاورتی اختیارات کا دائرہ اس دفعہ میں وسیع کرکے حقائق سے متعلق سوالات کو بھی اسی میں شامل کر دیا گیا۔

مگر آزاد ہندوستان کی آئین تاریخ میں ایودھیا پر استصواب وہ پہلا معاملہ ہے جس میں صدر نے حقائق سے متعلق ایک سوال پر سپریم کورٹ سے رائے طلب کی۔ اس سے قبل چھ مواقع ایسے آچکے تھے جب ہندوستانی وفاق کی انتظامیہ کے سربراہ نے عدالت عظمی کی رائے جاننی چاہی۔ سارے

اگر حکومت مسئلہ کے حل میں سنجیدہ ہوتی تو دفعہ ۱۴۳ کے بجائے دفعہ ۱۳۸ کے تحت تمام مقدمات سپریم کورٹ کے حوالے کردیتی

واقعات میں استصواب کا تعلق زیادہ تر کسی فیصلہ طلب قانون یا معاہدے کی آئینی اہمیت سے تھا۔ در حقیقت 1951 میں دستور ہند کے نفاذ کے بعد پہلے صدارتی استصواب "دہلی لاز ایکٹ مجریہ 1912" سے متعلق تھا۔ دوسرا استصواب بھی فیصلہ طلب قانون سے تعلق رکھتا تھا اور وہ تھا 1957 کا کیرالا ایجوکیشن بل جو صوبائی اسمبلی نے منظور کر دیا تھا اور اس پر صدر جمہوریہ کی منظوری کا انتظار تھا۔ یہ بل کیرالا میں تعلیمی اداروں کو قانونی حیثیت دینے کے لئے تجویز کیا گیا تھا اس پر اقلیتی گروہوں کی طرف سے سخت تنقیدیں ہوئیں کیونکہ اس سے اپنی مرضی کے تعلیمی ادارے چلانے کے ان کے حق پر ضرب پڑتی تھی۔ ایسا دوسرا واقعہ جس میں کوئی فیصلہ طلب بل استصواب کا موضوع بنا ہو 1979 میں پیش آیا جب اس وقت کے ایک ممبر پارلیمنٹ رام جٹھ ملانی نے ایمرجنسی کے دوران زیادتیوں کے مرتکب افراد پر مقدمہ چلانے کی غرض سے اسپیشل کورٹ کے قیام کے لئے "پرائیویٹ ممبر بل" کو متعارف کرایا۔

1960 میں بیروباڑی یونین کے سلسلے میں مشرقی عبوری علاقوں کے تبادلے کے موضوع پر ہند۔ پاک معاہدہ سے متعلق تنازعے کو حل کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے مشاورتی اختیارات کا سہارا لیا گیا تھا۔ 1965 میں ایوان کی توہین کے مرتکب افراد کو سزا دینے کے لئے مقننہ اور ہائی کورٹ کے دائرہ اختیار کی تجدید کے ضمن میں سپریم کورٹ سے اپنی رائے دینے کی درخواست کی گئی۔

1974 میں ایک بحث یہ چلی کہ کیا گجرات اسمبلی کے معطل رہنے اور گجرات کی مجلس قانون ساز کے ممبران کے حق رائے دہندگی سے محروم ہو جانے کے باوجود صدارتی انتخاب کرایا جاسکتا ہے۔ عدالت عظمی کا جواب اس موقع پر اثبات میں تھا۔ تاہم ان تمام سابقہ معاملات میں سپریم کورٹ اس پر رضامند تھی کہ اس سے رجوع کئے گئے سوالوں کے جواب وہ دے گی۔ البتہ ایودھیا کا معاملہ اپنی نوعیت کا واحد معاملہ ہے جس کی طرف سے سپریم کورٹ نے منہ پھر کر کہہ دیا کہ وہ اسے شرف سماعت نہیں بخشے گی۔

امریکہ اور آسٹریلیا جیسے ممالک میں جہاں انتظامیہ اور عدلیہ کی علاحدہ حیثیتوں کا پورا لحاظ رکھا جاتا ہے عدالت عظمی کوئی ایسا مشورہ نہیں دیتی۔ امریکی سپریم کورٹ خود سے رجوع کیے گئے سوالات کا جواب دینے سے ہمیشہ انکار کرتی رہی ہے اور اس کے پیچھے یہی یقین کارفرما ہے کہ یہ عدالت کی ذمہ داری یا کام نہیں ہے کہ فرضی استفسارات کا جواب دیتی رہے اور یہ کہ ایسے معاملات پر کوئی خیال ظاہر کرنا عدالت کا کام نہیں ہے۔ آسٹریلیائی ہائیکورٹ اور جاپان کی سپریم کورٹ بھی اسی اصول پر کاربند ہیں۔

مشاورتی دائرہ اختیار کے نکتہ چیں قانون کی ایسی کسی مد کی مخالفت کرکے انتظامیہ اور عدلیہ کے درمیان خط فاصل کو دھندلا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک معاملے میں برطانیہ کی جوڈیشیل کمیٹی نے یہ خیال ظاہر کیا کہ "ایسے حالات میں صادر کی گئی ہر رائے قانونی افسران کی رائے سے زیادہ اثر نہیں رکھتی"۔

ایک اور خامی اس طرح کے استصواب کی یہ ہے کہ اس کے تحت صادر کی گئی رائے کو بااختیار طریقے سے نافذ کرنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ یہ صدر جمہوریہ پر واجب نہیں ہے کہ وہ اس رائے کی بنیاد پر کوئی اقدام کرے اور جہاں تک ماتحت عدالتوں کا بھی سوال ہے تو یہ رائے صرف ترغیبی اہمیت رکھتی ہے البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کی سطح بہت بلند ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ سپریم کورٹ استصواب کی شرائط کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی۔ صدارتی انتخابات سے متعلق 1974 کے استصواب میں ان شرائط میں یہ شامل تھا کہ اس وقت گجرات میں انتخاب کرانا ناممکن تھا۔ اس دعوے کو سابق بھارتیہ جن سنگھ نے چیلنج کیا تھا۔ لیکن سپریم کورٹ نے یہ کہا کہ اسے استصواب کی شرائط کی صحت کے تیقن کا کوئی اختیار نہیں اور اس کی پابندی سے تعمیل کرنی ہوگی۔

بیشتر سابقہ معاملات میں عوامی اہمیت کے کسی مسئلہ پر نزاع کو ختم کرنے کے لئے سپریم کورٹ کے مشاورتی اختیارات کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے استفادہ کیا گیا ہے اور وہی کام ایودھیا کے معاملے میں بھی ہوا۔ حکومت نے بھی ہر موقع پر سپریم کورٹ کی رائے کو تسلیم کیا اور اس بار بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ایسا کرنے پر رضامند تھی۔

تاہم ایودھیا کے معاملے میں متنازعہ جگہ پر معینہ مدت کے بعد کسی مندر کے وجود کے سوال پر استصواب کی عبارت بذات خود متنازعہ تھی۔ یہ بات بھی غیر واضح تھی کہ سپریم کورٹ کے اخذ کردہ نتیجے سے خواہ وہ مثبت ہو یا منفی کون سا مقصد حاصل ہونے والا ہے۔ غالباً اپنے رول کی ادائیگی کے اسی سوال نے عدالت عظمی کو استصواب کا جواب نہ دینے پر مجبور کیا۔

اگر مرکزی حکومت اس مسئلہ کا فوری عدالتی حل نکالنے میں دلچسپی رکھتی تو دستور کی دفعہ 138 کے تحت موزوں پارلیمانی قانون کے مطابق پورا تنازعہ سپریم کورٹ کے حوالے کیا جاسکتا تھا یہ کہیں بہتر اقدام ہوتا۔ مذکورہ دفعہ کی رو سے پارلیمنٹ یونین لسٹ میں شامل کسی بھی معاملہ پر عدالت عظمی کے اختیارات کو وسعت دینے کی مجاز ہے۔ اس دفعہ میں یہ گنجائش بھی ہے کہ کوئی معاملہ جو صوبائی لسٹ میں شامل ہو اس پر بھی استصواب ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پارلیمنٹ مرکزی حکومت اور متعلقہ صوبائی حکومت کے مابین خصوصی معاہدے کے بعد اس سلسلے میں کوئی ضروری قانون نافذ کر دے۔ اس طرح شاید عدلیہ اور انتظامیہ دونوں اپنی ذمہ داری بہتر طریقے سے انجام دے سکتے تھے۔

(انگریزی سے ترجمہ)

بل کلنٹن کا بین الاقوامی رول اور یاسر عرفات کا نوبل امن انعام ایک مغربی کارٹونسٹ کی نظر میں

بقیہ: الیکٹرانک پوسٹ مین

تشویش ناک صورت حال تو پیدا ہونے والی نہیں ہے۔ دوسری طرف اس سائنسی نعمت نے ایک ایسی مسرت سے بھی انسان کو محروم کردیا ہے جس کا تعلق نفسیات سے ہے مثلاً یہ کہ خط کا لفافہ کھولنے میں ایک عجیب نیا لطف آتا ہے اس خیال سے کہ اس کے اندر کیا ہوگا، کاغذ کی قسم، تحریر، انداز بیان وغیرہ سے مرسل الیہ لکھنے کے بارے میں اپنے تاثرات قائم کرتا ہے۔ کسی کو ڈاک کے ٹکٹ جمع کرنے کا شوق ہوسکتا ہے۔ ان ٹکٹوں سے کسی ملک کی نباتات، حیوانات، عظیم شخصیتوں اور جغرافیائی خصوصیات کا بھی علم ہوتا ہے اب ایسے تجسس اور شوق کی تسکین نہ ہوپائے گی، اس نعمت سے فائدہ اٹھانے والے افراد کو بحیثیت انسان ایک خسارہ اور برداشت کرنا پڑے گا۔ پہلے تو آدمی اگر چاہے تو یہ کہہ کر صاف نکل جاتا تھا کہ کوئی اطلاع اس تک قطعاً یا بروقت نہیں پہونچی۔ اب اس عذر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کیونکہ جیسے ہی کسی سرے سے ایک پیغام کی ترسیل کی ابتداء ہوتی ہے تو دوسرے ہی لمحہ متعلقہ سرے پر رکھے ہوئے اسکرین پر اس کی علامت ظاہر ہوجاتی ہے جس سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔ یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی پیغام ڈاک کی طرح راستے میں ضائع یا تلف ہوگیا۔

ترقی یافتہ مواصلاتی ذرائع کے طفیل میں

بازار آپ کے دروازے پر

ترقی یافتہ مواصلاتی ذرائع نے وقت اور فاصلے کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ مختلف شعبہ ہائے حیات کی سرگرمیوں میں انسانی ہاتھوں کی شرکت کو کس قدر محدود کر دیا ہے یہ سب پر عیاں ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ بعض لوگ اس وقت کے تصور سے سہم جاتے ہوں جب شاپنگ جو متمول ممالک میں چند بچی کھچی سماجی سرگرمیوں میں رہ گئی ہے وہ بھی ایسے بے رونق تجربے کی شکل اختیار کر لے جس میں انسانوں کا کوئی حصہ نہ ہو۔ انٹر ایکٹو ہوم بیسڈ شاپنگ کا فروغ اسی صورت حال کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو ڈپارٹمنٹل اسٹوروں کی "چیک آوٹ" قطار میں کھڑے ہوئے ملنے جلنے والوں سے خوش گپیوں کا لطف جاتا رہے گا۔ امیر تو اپنے قلعہ نما مکانوں میں بند ہو کر رہ جائیں گے، خوش حال لوگ سڑکوں پر سے غائب ہو جائیں گے اور چاروں طرف مفلس و نادار ہی گھومتے دکھائی دیں گے۔ سپر مارکیٹ سے ملحق کار پارکنگ کے میدان خس و خاشاک کا جنگل بن جائیں گے۔

توقع ہے کہ سن 2005ء تک لوگوں کو شاپنگ کے لئے گھر سے باہر قدم نہ رکھنا پڑے گا۔ آپ اپنے ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر ماؤس کی مدد سے عام استعمال کی اشیاء کی فہرست طلب کریں۔ جب وہ سامنے آ جائے تو اس میں سے بعض اشیاء جو اس سے قبل آپ کو پسند نہیں آئی تھیں یا وہ بد ذائقہ تھیں انہیں خارج بھی کر دیجئے۔ کوئی نئی چیز نظر آئے تو اسے شامل فہرست کر لیں۔ بلکہ اس کی بھی گنجائش ہے کہ اگر آپ کیلا یا کوئی دیگر پھل ادھ کچا ہی لینا چاہتے ہوں تو اس سے متعلق وضاحتی نوٹ بھی دے دیجئے۔ متعلقہ اسٹور سے یہ ساری چیزیں ایک گھنٹے کے اندر آپ کی رہائش گاہ پر پہنچا دی جائیں گی۔

اب بعض دوسرے سامانوں کی خریداری کی طرف آئیے۔ فرض کیجئے آپ کو ویکوم کلینر خریدنا ہے۔ اسکرین پر فہرست طلب کرنے پر ویکوم کلینر کی ایک درجن اقسام مع ضروری تفصیلات کے آپ کے سامنے کر دی جائینگی۔ مثلاً آپ کو یہ معلوم ہو جائے گا کہ وہ لیزر کنٹرول سے چلنے والا ہے اور یہ کہ اس کی قیمت شہر کے عام اسٹوروں میں بکنے والے ویکوم کلینر سے کتنے فیصد کم ہے۔ اس کے بعد دوسری فہرست طلب کریں گے آپ جنس پتلون اور موزے وغیرہ بھی اپنے پسندیدہ رنگوں میں لے سکتے ہیں۔

ملٹی میڈیا کے پرستاروں کے ذہن میں شاپنگ کے مستقبل کا کچھ ایسا ہی نقشہ ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آئندہ دس سال کے عرصے میں امریکہ میں ایک طرف انٹر ایکٹو ہوم بیسڈ شاپنگ سے فروخت میں ہر سال تین ہزار بلین ڈالر کا اضافہ ہو گا تو دوسری طرف انتظامی اخراجات سے پریشان خوردہ فروشوں کا دیوالیہ نکل جائے گا۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انٹر ایکٹو ہوم بیسڈ شاپنگ کے ہاتھوں بازاروں اور سڑکوں کی ویرانی و بے رونقی کے اندیشے قبل از وقت اور غلط اندازوں پر مبنی ہیں اور اس طریقہ خریداری کو وجود میں آنے میں ابھی خاصا وقت لگے گا۔ اس سے پہلے کہ اسے پوری طرح فروغ حاصل ہو بہت سی باتیں ضروری ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ پندرہ سال کی عمر سے زائد افراد میں سے ایسے بہت کم ہیں جو تفریح طبع کے سوا کسی اور مقصد کے لئے ٹیلی ویژن استعمال کرتے ہوں۔ ٹیلی ویژن کو انٹر ایکٹو بنانے کے لئے درکار "سیٹ ٹاپ باکس" کے سستے ہونے کا مستقبل قریب میں کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس کے علاوہ ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے کہ شاید صارفین شاپنگ کے روایتی طریقے سے دست بردار نہ ہونا چاہیں جس میں اشیاء کی اچھی طرح جانچ پڑتال، مول بھاؤ کرنے، ہلانے جلانے یا سونگھنے کی پوری آزادی ہوتی ہے بجائے اس کے کہ ان کی خصوصیات کے تصور پر ہی اکتفا کیا جائے۔ وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کو امرود سیب خریدنا ہے تو اسکرین پر اس کی تصویر یا کسی کی بیان کردہ صفات پر اعتماد کرنے سے زیادہ صرف اپنے براہ راست نظر آنے والے تجربہ پر بھروسہ کرے گا۔

یہی وہ عوامل ہیں جن کی بناء پر الیکٹرونک خوردہ فروشی کے فروغ میں رکاوٹ اور تاخیر واقع ہو سکتی ہے تاہم اس کو بالکل روکا نہیں جا سکتا۔ اس لئے کہ اس ضمن میں اہم ترین سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صارفین اس طریقہ کار کو کیوں اختیار کریں گے۔ صارفانہ ذہنیت تو یہ کہتی ہے کہ اس کی مقبولیت اسی صورت میں ممکن ہے جب دوسرے اسٹوروں کے مقابلے میں یہ لوگوں کو بعض سہولتیں یا مراعات فراہم کرے۔ ان سہولتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ خصوصاً سبزی، آٹا اور دیگر استعمال کی اشیاء اور ملفوف اشیاء خوردنی کی ہر ہفتے خریداری کے اکتا دینے والے عمل سے راحت ملتی ہو۔ اور ہو سکتا ہے کہ آج بھی کوالٹی کی طرف سے محتاط صارفین ہوم ڈیلیوری کے عوض چند روپے زیادہ خرچ کرنے کو ترجیح دیتے ہوں۔ بہر حال انٹر ایکٹو شاپنگ کا تصور اگر پوری طرح حقیقت میں بدل گیا تو صارفین کے حق میں بہت بہتر ہو گا لیکن خوردہ فروشوں کے سامنے ایک بڑا چیلنج کھڑا ہو جائے گا۔

انٹر ایکٹو شاپنگ کے طریقہ کار کو صارفین میں مقبول بنانے کے لئے بازار کے نرخ اور مسابقتی شرح پر مال بیچنے کے طریقوں کی طرف سے کافی ہوشیار رہنا ہو گا۔ اس میں عام اسٹوروں کے مقابلے میں سستے داموں پر معیاری، صاف ستھری اور پائدار اشیاء کو فروخت کرنے کی صلاحیت کو بڑی اہمیت حاصل ہوگی۔ اس پر برابر نظر رکھنی ہوگی کہ سامان سستا بیچنے کی دھن میں غیر معیاری چیزیں تو صارفین تک نہیں پہنچ رہی ہیں جو آئندہ کسی کمپنی کی ساکھ کو متاثر کرے اور اسے دیگر قانونی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑے۔ قیمت کو کنٹرول میں رکھنے اور مسابقت کے محاذ پر جمے رہنے میں سب سے زیادہ مدد اس بات سے ملے گی کہ انٹر ایکٹو شاپنگ پر کتنا صرفہ آ رہا ہے اور یہ کہ فینسی اسٹور اور چیک آوٹ کاونٹر پر بٹھائی گئی لڑکیوں پر آنے والے خرچ کے مقابلے میں ہوم ڈیلیوری بوائز کی ایک بڑی ٹیم پر کتنا خرچ آئے گا۔

جہاں تک سڑکوں کے ویران ہو جانے کا سوال ہے تو ایسا کوئی امکان ہے نہیں کہ لوگ دل بستگی کے لئے باہر نکلنا چھوڑ دیں گے۔ پہلے جو لوگ ہر ہفتے ہاتھوں میں تھیلے لیے ہوئے سر بازاروں کی بھیڑ بھاڑ میں مصروف نظر آتے تھے وہ آج بھی اسی طرح گھروں سے نکلیں گے۔ ہاں ان کا مقصد کچھ اور ہو گا مثلاً ہوا خوری اور ملاقات۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ یہی وقت وہ اس طرح گذاریں کہ کسی ماہر درزی، قصاب یا سنار کے پاس گذاریں جن کی خدمات ان کے لئے ہی مخصوص ہوں۔ ایسے لوگوں کی دوکانوں کو ہر حال میں چمکنا ہی ہے خواہ ان کا سامان عام اسٹوروں اور انٹر ایکٹو ہوم بیسڈ شاپنگ کے مقابلے میں مہنگا ہی کیوں نہ ہو اس کی وجہ یہی ہے کہ ان کے یہاں گاہک کو یہ اطمینان قلب حاصل رہتا ہے کہ ان کی تمام تر توجہ کا مرکز وہ شخص ہے جو ان کے یہاں کسی مخصوص وقت میں آتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جو اگر خوردہ فروش ذہن نشین کر لیں تو کوئی وجہ نہیں کہ انہیں اپنے تجارتی حریفوں سے مات کھانی پڑے۔

کچھ لوگوں کو خدشہ ہے کہ اگر ایسا ہو گیا تو ڈپارٹمنٹل اسٹوروں کے سامنے قطار میں کھڑے ہوئے لوگوں کے لئے خوش گپیوں کا لطف جاتا رہے گا۔ امیر تو اپنے قلعہ نما مکانوں میں بند ہو کر رہ جائیں گے۔ خوش حال لوگ سڑکوں پر سے غائب ہو جائیں گے اور چاروں طرف مفلس نادار ہی گھومتے ہوئے نظر آئیں گے۔

توقع ہے کہ 2005 تک لوگوں کو شاپنگ کے لئے گھر سے نکلنا نہیں پڑے گا۔ لوگ اپنے ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھ کر ماؤس کی مدد سے عام استعمال کی اشیاء طلب فرمائیں گے اور ناپسندیدہ چیزوں کو فہرست سے خارج کر دیں گے۔ متعلقہ اسٹور سے ساری چیزیں ایک گھنٹے کے اندر اندر رہائش گاہ پر پہنچ جائیں گی۔

برق رفتار الیکٹرانک پوسٹ مین

اب آپ دنیا کے کئی حصوں میں اپنے گاہکوں سے بیک وقت رابطہ قائم کر سکتے ہیں

مواصلاتی دنیا میں جمع کردہ معلومات کو تیزی اور پوری مہارت سے دوسرے سرے تک منتقل کرنا ہی کامیابی کی کلید ہے۔ اور غالباً اس کا اطلاق تجارت اور لین دین کے میدان میں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ تجارتی ادارے خواہ چھوٹے ہوں یا بڑے سب کو اپنے گاہکوں اور صارفین کی ضرورتوں، شکایات اور بازار میں دستیاب مواقع سب کی طرف بیک وقت متوجہ رہنا پڑتا ہے۔ تاہم کوئی بھی نظام سہولت، رفتار راز داری اور بچت کے اعتبار سے متوقع معیار پر پورا نہیں اتر پاتا۔ ابھی حال ہی میں ایک ایسی چیز جو افراد کے درمیان ذاتی ترسیل کے مقصد سے بنائی گئی تھی آج تجارتی مواصلات کا ایک اہم وسیلہ ثابت ہو رہی ہے جسے ہم الیکٹرونک میل کے نام سے جانتے ہیں۔

آفس آٹو مشین سسٹم لوکل ایریا نیٹ ورک اور پرسنل کمپیوٹر پر انحصار کرنے والی کمپنیوں کو ہمیشہ اس دشواری کا سامنا رہا ہے کہ وہ مقامی اور بیرونی شرکاء اور دیگر متعلق لوگوں سے کس طرح بہتر رابطہ قائم رکھیں۔

الیکٹرونک میل کے نظام میں ایک خوش آئند تبدیلی آئی ہے جس سے اس کے موثر استعمال کی راہ میں حائل رکاوٹ کو دور کر دیا گیا ہے اور اس سے استفادہ کرنے والے تمام لوگ آپس میں معلومات کا تبادلہ کر سکتے ہیں۔ عالمی الیکٹرونی ترسیلی خدمات جی ای ایم ایس 400 نے اب یہ کام آسان کر دیا ہے اب چاہے اسے لوکل ایریا نیٹ ورک یا منی اور مین فریم کمپیوٹر تک محدود رکھیں ہر شخص کی رسائی اس سہولت تک ہو سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہارڈ ویر میں اضافی سرمایہ لگائے بغیر کوئی کمپنی اپنی پیداوار اور آمدنی دونوں میں اضافہ کر سکتی ہے۔ انہیں یہ آسانی بھی حاصل ہے کہ اپنی موجودہ مشینوں کو ہی عالمی ترسیلی نظام میں تبدیل کر لیں اور کوئی شخص اپنی میز سے ہٹے بغیر الیکٹرونک میل، فیکس یا ٹیلیکس پیغام بھیج اور وصول کر سکتا۔ موجودہ مشینوں اور جیمس 400 کے مشترک استعمال سے سافٹ ویر کے استعمال کرنے والے لوگ دنیا میں کہیں بھی اپنے گاہکوں، ذیلی شاخوں، تقسیم کاروں، خوردہ فروشوں، سپلائروں، پروجیکٹ ٹیموں اور سیلز دفاتر سے بیک وقت رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

اس سسٹم کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ جیسا کہ محسوس کیا جا رہا ہے کہ ہمارے مواصلاتی وسائل موجودہ تجارتی ضروریات کا ساتھ نہیں دے پا رہے تھے اور اس ایجاد نے گویا منضبط اور منافع بخش تجارت کے لئے راہ ہموار کر دی ہے اب کوئی تاجر نہ صرف زیادہ اعتماد کے ساتھ خرید و فروخت کے معاملات کا فیصلہ کر سکتا ہے بلکہ بازار کا مزاج بدلنے سے پہلے مسابقت کا رخ پہچان کر اپنی حکمت عملی میں تبدیلی بھی لا سکتا ہے۔ جب کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ بازار کی صورت حال سے متعلق اطلاع تاخیر سے موصول ہونے کی بنیاد پر کافی نقصان بھی اٹھانا پڑتا تھا۔

جیمس 400 کی مدد سے الیکٹرونک میل اور 2 Asc کی فائلوں کا تبادلہ بھی ممکن ہے اس کے تحت کوئی شخص اپنے کمپیوٹر ٹرمنل پر اطلاعات وصول کر سکتا ہے اور وہاں سے انہیں دنیا بھر میں پھیلے ہوئے سترہ لاکھ ٹیلیکس داروں تک منتقل کر سکتا ہے۔ اسی طرح پرسنل کمپیوٹر ٹرمنل کے ذریعے بھی بیالیس فیکس مشینوں کو پیغامات دیئے جا سکتے ہیں اور اگر ضروری سمجھا گیا تو پیغام کی ترسیل کے دیگر پہلوؤں کو بہتر بنایا جائے گا مثلاً یہ کہ نشاندہی کا پیغام کس وقت مطلوبہ منزل پر پہنچایا گیا۔ ہر طرح کے پرسنل کمپیوٹر، ٹرمنل، ورڈ پروسز، ٹیلیکس مشین اور الیکٹرونک ٹائپ رائٹر کو جیمس 400 سے مربوط کیا جا سکتا ہے جس کے لئے بنیادی لوازم صرف پی سی ٹرمنل، ترسیلی سافٹ ویر اور ایک معیاری موڈم ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیمس 400 کی بدولت ایک انگلی کے اشارے پر دنیا کے ایک سو چالیس ممالک میں بیک وقت ہزاروں افراد سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس کی بدولت انسان خود بھی روبوٹ بن کر رہ جائے گا جو رات دن ٹیلی ویژن اسکرین کے سامنے بیٹھا اطلاعات وصول کرتا رہے۔ پہلے تو ڈاک کی ڈلیوری کے مقررہ اوقات ہوتے تھے لیکن اب یہ عمل ہر وقت جاری رہے گا اور ایسے میں یہ دیکھنے کی ضرورت ہر وقت پیش آئے گی کہ کہیں کوئی

(باقی ص۱۷ پر)

اس میں کوئی شک نہیں کہ جیمس 400 کی بدولت ایک انگلی کے اشارے پر دنیا کے ایک سو چالیس ممالک میں بیک وقت ہزاروں افراد سے رابطہ قائم کیا جا سکتا ہے۔ لیکن یہ بھی ذہن نشین رہے کہ اس کی بدولت انسان خود بھی روبوٹ بن کر رہ جائے گا جو رات دن ٹی وی اسکرین کے سامنے بیٹھ کر اطلاعات موصول کرتا رہے گا۔

خلیج فارس کی جغرافیائی، معاشی اور فوجی اہمیت

ایران کے اسلامی انقلاب کے اثرات ونتائج کا بھرپور جائزہ

خلیج فارس کی جغرفیائی، فوجی، معاشی اور سیاسی اہمیت ہمیشہ مسلم رہی ہے۔ لیکن 1990 کی دہائی میں اسکی فوجی و سیاسی اہمیت خصوصی طور سے اجاگر ہو کر سامنے آئی۔ ایک دنیا کی توجہ اس علاقے کی بدلتی ہوئی صورت حال پر مرکوز رہتی ہے۔ اور جب تک ترقی یافتہ ممالک خصوصاً جاپان اور مغربی یورپ کا خلیج فارس پر تیل کے لئے انحصار باقی رہے گا اس وقت تک یہ علاقہ ان کی خصوصی توجہ کا مرکز بھی بنا رہے گا۔ اس بنیادی حقیقت کو سمجھے بغیر بین الاقوامی سیاست وتعلقات میں خلیج فارس کی فوجی و سیاسی اہمیت کو سمجھنا مشکل ہوگا۔ زیر تبصرہ کتاب میں اس امر کو واضح کیا گیا ہے کہ خلیج فارس میں کسی بھی سیکورٹی نظام یا انتظام میں ایران کی اہمیت کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔

زیر تبصرہ کتاب پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا باب خلیج فارس میں کشیدگی سے بحث کرتا ہے۔ دوسرا باب اسکے سیاسی و معاشی پہلو سے متعلق ہے۔ تیسرا باب اسلام اور انقلاب کے بارے میں ہے، اور چوتھا حصہ اسلامی انقلاب کے بعد ایران میں معاشی تباہی و نابرابری سے بحث کرتا ہے جبکہ پانچواں اور آخری حصہ ایران و عرب دنیا اور ایران اور سپر پاور کے بارے میں ہے۔ ان کے علاوہ کتاب میں جنگ کے معاشی نقصانات اور ایران، عراق اور سعودی عرب کے فوجی اخراجات سے متعلق اعداد و شمار بھی شائع کئے گئے ہیں۔

انکی کیڈی معروف ماہر ایران ہیں جن کے خیالات سے بہت سے لوگ اتفاق نہیں کرتے۔ اپنے مضمون "ایران انقلابی کیوں رہا ہے" میں انہوں نے ایران کے 1979ء کے انقلاب کے اسباب و عوامل سے بحث کی ہے۔ ان کے نقطہ نظر سے تین عوامل یا اسباب خصوصی طور سے قابل توجہ ہیں۔ شیعہ علماء کا رول، اسلام سے قبل کے ثقافتی ورثے سے شغف اور ایران میں خارجی طاقتوں کا رول۔ ان عوامل نے کیڈی کے بقول انقلاب ایران میں اہم رول ادا کیا تھا۔

اے۔ آر۔ نارٹن نے اپنے مضمون میں لبنان کے شیعہ فرقے پر ایران کے انقلاب کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ نارٹن کے خیال میں انقلاب ایران نے لبنانی شیعوں کو اپنے تشخص کا احساس دلایا مزید برآں وہ انقلاب ایران کو عمل و تحریک کی مثال کے طور پر نہ کہ اپنے خاص لائحہ عمل کے ماڈل کے طور پر پسند کرتے ہیں۔ بہر کیف ایرانی انقلاب کے بعد امل اور بعد میں حزب اللہ کے استحکام سے جہاں ایک طرف فلسطینی تحریک کے لئے ایک چیلنج پیدا ہوا وہیں یہ ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ جنوبی لبنان میں شیعوں نے اسرائلی عزائم کو ناکام بنانے میں بھی اہم رول ادا کیا۔

ہوشنگ امیر احمدی نے اس کتاب میں دو مضامین لکھے ہیں۔ اول "مابعد انقلاب ایران میں معاشی تباہی اور نابرابری" اور دوسرا "معاشی تعمیر نو کا ایرانی منصوبہ اور اسکی کامیابی کے امکانات" ان دونوں مضامین میں ہوشنگ نے تجزیے کا معروضی انداز اختیار کیا ہے۔ ان کے بقول جہاں ایران بالعموم جنگ کے نقصانات سے متعلق اعداد و شمار کو بڑھا کر پیش کرتا ہے وہیں دوسرے لوگ انہیں گھٹا کر پیش کرتے ہیں۔ اعداد و شمار کی ٹیبلوں کے ذریعہ ہوشنگ نے ایک صحیح نتیجہ اخذ کرنے کی سعی کی ہے۔ اسی کے ساتھ ہوشنگ یہ بھی کہتے ہیں کہ اکثر لوگ ماحولیات کو پہونچنے والے نقصانات یا نتائج کو نظرانداز کر دیتے ہیں یا پھر ایران نے شام کو بطور تحفہ جو تیل دیا یا خلیج فارس میں جنگی خطرے کی وجہ سے تیل کے ٹینکروں کو طویل راستوں سے بھیجنے اور ان کی انشورنس جو پر زائد اخراجات آئے، انہیں بھی بالعموم لوگ اپنے مطالعہ میں شامل نہیں کرتے۔

نادر انصار کا مضمون "خلیج فارس میں غیر اشتعال انگیز دفاع" بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انصار کے خیال میں علاقے کے ایک جنگی اکھاڑہ بن جانے کی وجہ سے اس میں واقع اہم ممالک جیسے ایران، عراق اور سعودی عرب میں سیاسی غیر یقینی کا ماحول پیدا ہوگیا ہے۔ اسی کے ساتھ انصار نے مصر کو بھی اس علاقے میں جنگجویانہ ماحول کو فروغ دینے کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے۔ انصار کہتے ہیں کہ خلیج فارس کے علاقے میں کسی بھی دفاعی انتظام کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ متعلقہ ممالک ہتھیار جمع کرنے کی دوڑ سے باہر آ جائیں۔

محسن میلانی کا مضمون "اسلامی انقلاب اور امریکہ کی خارجہ پالیسی" اسلامی انقلاب کے بارے میں امریکی رویے اور رد عمل سے متعلق ہے۔ میلانی کے بقول امریکہ نے انقلاب ایران کی مخالفت کر کے ایک طرف تو اپنی اس ذہنیت کا مظاہرہ کیا کہ اسے مغرب نواز اور اپنے عوام کے مخالف حکمرانوں سے خاص شغف ہے اور دوسری طرف ان خامیوں کو نمایاں کیا جو امریکی اداروں میں موجود ہیں اور جنکی وجہ سے وہ انقلاب کا ساتھ دینے کے بجائے ان کی مخالفت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جب انقلاب آیا تو امریکہ اس ملک میں نہ صرف تنہا اور بے طاقت ہو کر رہ گیا بلکہ عوامی انقلاب کی ناعاقبت اندیشانہ مخالفت میں لگ گیا۔

بحیثیت مجموعی یہ کتاب ایران کے اسلامی انقلاب کے اثرات و نتائج کے مختلف پہلوؤں پر اطمینان بخش طور پر روشنی ڈالتی ہے۔ کتاب کی بعض آراء سے بعض ناظرین کو اختلاف ہو سکتا ہے مگر اس علاقے پر نظر رکھنے والوں کے لئے اس کی افادیت اور ضرورت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔

نادر انصار کا مضمون "خلیج فارس میں غیر اشتعال انگیز دفاع" بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ انکے خیال میں علاقے کے ایک جنگی اکھاڑا بن جانے کی وجہ سے اس میں واقع اہم ممالک جیسے ایران، عراق اور سعودی عرب میں سیاسی غیر یقینی کا ماحول پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ انصار نے مصر کو بھی اس علاقے میں جنگ جویانہ ماحول کو فروغ دینے کے لئے مورد الزام ٹھہرایا ہے۔

انکی کیڈی معروف ماہر ایران ہیں، جن کے خیالات سے بہت سے لوگ اتفاق نہیں کرتے۔ اپنے مضمون "ایران انقلابی کیوں رہا ہے" میں انہوں نے ایران کے 1979ء کے انقلاب کے اسباب و عوامل سے بحث کی ہے۔ ان کے نقطہ نظر سے تین عوامل خصوصی طور سے قابل توجہ ہیں۔ شیعہ علماء کا رول، اسلام سے قبل ثقافتی ورثے سے شغف اور ایران میں خارجی طاقتوں کا رول۔ ان عوامل نے کیڈی کے بقول انقلاب ایران میں اہم رول ادا کیا تھا۔

Reconstruction and Regional Diplomacy in the Persian Gulf by (ed.)
H. Amirahmadi and N. Entessar,
Routledge : 11 New Fetter Lane,
London , EC4P 4EE, U.K. 1992

اسلام میں زائد مال کا مصرف

نظریاتی اور عملی پہلو

قومی زندگی میں اسلامی اقتصادیات کو فروغ دینے کے لئے زیادہ سے زیادہ جد وجہد کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی جاتی رہی ہے۔ قطر یونیورسٹی میں کلیہ شرعیہ سے وابستہ ڈاکٹر یوسف ابراہیم کی کتاب جسے قطر کی وزارت اوقاف وامور اسلامیہ نے شائع کیا ہے اسلامی اقتصادیات کی تشریح کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ چھ ابواب اور تعارف پر مشتمل اس کتاب میں مصنف نے اسلامی اقتصادی فکر کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے جو بیشتر محققین کی نظروں سے اب تک اوجھل تھے اور وہ پہلو ہیں زائد مال کے خرچ کے طریقے اور حیات اسلامی کی تعمیر اور تشکیل کی کوشش۔

پہلے باب میں انہوں نے وضاحت کی ہے کہ اقتصادی پسماندگی کا سبب قومی سطح پر یہ ہے کہ غیر ملکی قرضوں کا بوجھ حد سے زیادہ لدا ہوتا ہے کہ ملک کے عوام کے لئے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ وہ اپنا معیار زندگی بلند کریں یا قرض کی ادائیگی کریں۔ ان کے نزدیک قرضوں کے بوجھ کا اصل سبب ترقی کے لئے غیر ملکی سرمایہ پر انحصار اور مقامی وسائل کو ترقی دینے میں غفلت ہے اور اس مصیبت سے نکلنے کا یہی طریقہ ہے کہ جو غلطی اب تک ہوچکی ہے اس کا ازالہ کیا جائے اور قومی اقتصادیات میں پنہاں وسائل کو بروئے کار لایا جائے جس کا منبع شریعت ہے۔

مصنف نے لفظ عفو کے مفہوم کا قرآنی نصوص اور حدیث کی روشنی میں جائزہ لیتے ہوئے اسے زائد مال سے تعبیر کیا ہے اور تمام مفسرین اسی مفہوم پر متفق ہیں۔

چاہے مال و دولت ہو یا انسانی صلاحیتیں، اللہ کے بندوں کی راہ میں دونوں کو خرچ کرنا ضروری ہے۔ اور جن ممالک کے پاس مالی وسائل کی کمی ہے وہاں قومی تعمیر اور ترقیاتی منصوبوں کی کفالت میں انسانی جد وجہد کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ یہیں سے اقتصادی سرپلس اور عفو کے فرق کو سمجھا جاسکتا ہے۔ اقتصادی نقطہ نظر سے زائد مال کا اطلاق اس مقدار پر ہوتا ہے جو آمدنی میں سے اخراجات پورے کرنے کے بعد باقی بچے جب کہ عفو کا تعلق مادی مال و اسباب سے نہیں ہے بلکہ انسانی محنت وکاوش سے ہے جو اپنی ضروریات کی تکمیل کے علاوہ دوسروں کے لئے بھی بروئے کار لاتا ہے۔

تیسرے باب میں زائد مال کے مصرف کی وضاحت کرتے ہوئے مصنف نے انفاق یعنی خرچ کو فکر اسلامی کی رو سے صارفانہ، منفعتی اور اجتماعی زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ جس میں پہلی نوع کا خرچ مؤخر الذکر دو پر مقدم ہے جن کا تعلق عفو یا بچت سے ہے۔ صارفانہ انفاق کی تکمیل کے بعد ہی بقیہ دو زمروں کا مرحلہ آتا ہے۔ منفعتی انفاق کا مقصد سرمائے کی تشکیل اور افراد کی آمدنی بڑھانا ہے اور انفاق اجتماعی سے مراد رفاہ عام میں ہر مسلمان کی شرکت و مساہمت ہے جسکی ادنی صورت زکوۃ کی ادائیگی ہے جس کے لئے صاحب نصاب ہونا شرط ہے۔

زائد مال کے خرچ کی شرعی حیثیت یعنی فرض عین اور فرض کفایہ کی وضاحتوں سے گذر کر فاضل مصنف نے اس پہلو کا مطالعہ کیا ہے کہ مسلمان کے عمل خیر کا اس کی معاشرتی اور مقامی زندگی اور اس کے حالات پر کیا اثر پڑتا ہے۔ ان کے نزدیک اس عمل کا ایک فکری پہلو یہ ہے کہ ملی زندگی میں مسلمانوں کے درمیان باہمی سلوک و تفاعل کو استحکام ملتا ہے۔ اس طرح کہ دوسرے افراد اس کا احیاء کرتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں خیر واحسان تمام مالیاتی پالیسیوں کا محور قرار پاتا ہے جو اقتصادی ترقی کی راہ ہموار کرتا ہے۔

خیر واحسان کے رموز پر اظہار خیال کرتے ہوئے ڈاکٹر یوسف ابراہیم نے یہ موقف اختیار کیا ہے کہ یہ جذبہ ضروری نہیں کہ اصحاب ثروت ہی کے پاس ہو یعنی یہ کہ خیر کو مادی پیمانوں سے نہ پرکھا جائے۔ یہ صلاحیت ہر انسان میں موجود ہوسکتی ہے۔

اس سلسلہ میں خیر کے تین زمرے قائم کئے گئے ہیں:

انسانی صلاحیتوں کے ذریعے، مادی وسائل کے ذریعے اور نقد روپئے کے ذریعے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب تک اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہی نہ برتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنائے۔

صاحب ایمان پر لازم ہے کہ وہ اپنی زائد صلاحیت اپنے بھائیوں کی مدد اور معاشرے کی اصلاح میں لگائے اور جب اس کی صحت اور حواس اجازت دیتے ہیں وہ اس سے بے توجہی نہ برتے۔ اسے یہ بھی چاہئے کہ اپنی صلاحیتوں کو کار آمد بنانے کے لئے موزوں میدان عمل کا انتخاب کر کے لوگوں کی عام زندگی پر سکون اور بہتر بنالے۔

نام کتاب: انفاق العفو فی الاسلام
مصنف: ڈاکٹر یوسف ابراہیم کلیہ شریعہ قطر یونیوسٹی
ناشر: وزارہ الاوقاف والشوؤن الاسلامیہ، قطر

Invitation Price Rs. 3/-
16 - 30 November, 1994

The Milli Times International

(India's first International Urdu Weekly)

R.N.I. No. 57337/94
RGD. DL No.-16036/94

49, Abul Fazal Enclave, Jamia Nagar, New Delhi-110025 Phone:6827018

کیا مسیح دجال کے ظہور کا زمانہ قریب آگیا ہے ؟ اسلام کی عالمی سیاسی قوت کے خاتمے کے بعد یہ سوال اکثر مسلم ذہنوں میں شدت کے ساتھ اٹھتا رہا ہے کہ [illegible]ب دوبارہ نئے سرے سے اسلامی نظام کے قیام کے لئے مسیح موعود کی آمد کا زمانہ قریب آگیا ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ ظہور کا انتظار ایک مدت سے عیسائی دنیا کررہی ہے۔ شیعہ روایتوں میں امام غائب کا انتظار یا پھر جمہور اہل سنت کا یہ ماننا کہ قرب قیامت میں ایک بار پھر اسلامی نظام پوری دنیا پر قائم ہوجائے گا اور اس کام کے لئے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دوبارہ اس دینا میں تشریف لائیں گے۔ لیکن ان کے ظہور سے پہلے ایک چھوٹے مسیح کا ظہور ہوگا جو بالآخر حضرت مسیح کے ہاتھوں لد کے مقام پر مارا جائے گا۔ اسلام کی سیاسی قوت کے زوال کے ایام ہیں ہی علماء اور محدثین نے ظہور مہدی اور ظہور مسیح کے سلسلے میں پائی جانے والی احادیث اور روایتوں کا مطالعہ کیا اور ان میں سے بعض تو ان روایتوں کا سہارا لے کر خود ہی مہدی موعود یا قطب وقت بن بیٹھے۔ مثال کے طور پر سوڈان میں مہدی سوڈانی کا ظہور یا ہندوستان میں شاہ ولی اللہ کا خود کو قطب گرداننا اسی سلسلے کی کڑی ہیں، یہ حضرات اسلام کے سیاسی زوال سے سخت مضطرب تھے اور ان روایتوں کا سہارا لے کر ایک مرکزی اسلامی سیاسی قوت کا احیاء چاہتے تھے۔ شاہ ولی اللہ کو اس بارے میں بہت زیادہ عملی کامیابی نہیں ملی البتہ سوڈان کے مہدی نے برطانوی سامراج کے عین عالم شباب میں اسے شکست دے کر سوڈان میں ایک خالصتاً اسلامی حکومت قائم کرلی۔ ابھی دنیا سے خلافت کے خاتمے کو پون صدی بھی نہیں گذری ہے، مسلمانوں کا زوال اور ان کی سیاسی بے بسی کوئی بہت زیادہ پرانا عمل نہیں ہے۔ لیکن زوال کے اس مختصر سے عرصے میں پوری دنیا میں اسلام کے عالمی غلبے کے لئے مختلف قسم کی بے شمار تحریکیں چل رہی ہیں، ہنگامے برپا ہیں اور اسلام کو غالب دیکھنے کے آرزومند مسلم انقلابی دنیا کے مختلف خطے میں اپنی جانیں لٹا رہے ہیں۔ گویا رفتہ رفتہ پھر یہ احساس عام ہوتا جارہا ہے کہ اسلام دوبارہ دنیا کی عظیم ترین قوت بننے کے لئے بے چین ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعض احادیث میں دنیا کے خاتمے سے قبل اسلام کے عالمی غلبے کے لئے واضح اشارات موجود ہیں، گوکہ محدثین کے درمیان یہ بات اختلاف کا باعث رہی ہے کہ مہدی سے متعلق احادیث کو یا حضرت مسیح کی آمد سے متعلق اشارات کو خالصتا لفظی طور پر لینا چاہیئے یا استعاراتی انداز سے ؟ بعض مفکرین اسلام کے نزدیک مہدی کا ظہور کسی طلسماتی یا معجزاتی پس منظر کے بجائے خالصتا واقعاتی پس منظر میں ہوگا اور اس کے کارناموں کے تجزیے کے بعد ہی لوگ اس کی اصل حیثیت متعین کر پائیں گے۔ لیکن بعض مفکرین ان اشارات اور پیش گوئیوں کو تاریخ کی واضح پیش گوئی شمار کرتے ہیں اور وہ حادثات واتفاقات کو ان احادیث کی روشنی میں مرتب کرکے مستقبل کا ایک دلچسپ نقشہ پیش کرتے ہیں۔

(تفصیلات اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں)